۲۱

اِسلام کا فوجداری قانون

واقیموا الوزن
بالقسط
ولا تخسروا المیزان

شریعۃ اکیڈمی
بین الاقوامی اِسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

سلسلہ مطالعہ اسلامی قانون (۲۱)

اسلام کا فوجداری قانون

شہزاد اقبال شام

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ☆ اسلام آباد

اسلام کا فوجداری قانون

تالیف: شہزاد اقبال شام

نظر ثانی وراہ نمائی: ۱۔ جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد حسن

۳۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی

نگران شعبہ مطالعہ اسلامی قانون: ڈاکٹر عرفان خالد ڈھلوں

نگران منشورات: ڈاکٹر اکرام الحق یٰسین

ناشر: شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

طابع: اظہار پرنٹرز۔۹، ریٹی گن روڈ لاہور

طباعت اوّل: ۱۹۹۳ء ، دوم: ۱۹۹۶ء ، سوم: ۲۰۰۲ء

چہارم: ۲۰۰۳ء ، پنجم: ۲۰۰۶ء

قیمت: ۳۰ روپے

فہرست مضامین

۱- تمہید	۱
۲- حدود اور ان کے متعلقات	۳
(۱) زنا	۳
(۲) قذف	۵
(۳) شراب نوشی	۷
(۴) چوری	۸
(۵) حرابہ	۱۰
(۶) ارتداد	۱۲
(۷) بغاوت	۱۵
۳- قصاص و دیت	۱۷
۴- تعزیری سزائیں	۲۰
(۱) قتل	۲۰
(۲) کوڑے	۲۱
(۳) قید	۲۳
(۴) علاقہ بدری	۲۵
(۵) جرمانہ	۲۶
۵- غیر روایتی سزائیں	۲۷
۶- مزید مطالعہ کے لیے	۳۰
۷- حواشی و حوالہ جات	۳۰
۸- مصادر و مراجع	۳۱

پیش لفظ

اسلام کی طویل فکری اور عملی تاریخ میں مسلم اہل علم و دانش کو گوناگوں چیلنجوں اور مبارزتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دور تابعین میں وضع حدیث اور قضاء و قدر کے بارہ میں شبہات سے لے کر دور جدید کے مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے استیلاء تک کا یہ سارا زمانہ ایک مسلسل فکری جہاد اور علمی دفاع سے عبارت ہے۔ اس پورے دور میں اہل علم نے نہ صرف حالات زمانہ کو پیش نظر رکھا' بلکہ ہر نئی فکری مبارزت کے جواب میں اکثر و بیشتر انہی ہتھیاروں اور وسائل سے کام لیا جن سے کام لے کر اسلام پر اعتراضات کئے گئے۔ اس کی کامیاب ترین مثال یونانی علوم و فنون سے مسلمانوں کا معاملہ ہے۔ ابتدائی سو' سوا سو سال کے عبوری دور کے بعد بھی مسلمان مفکرین نے یونانی منطق اور فلسفہ سے اسلامی عقائد کی تفسیر و توضیح کی اور اسلامی تعلیمات کی تبیین و تفہیم کا وہ کام لینا شروع کر دیا تھا جس کے عجیب و غریب نمونے امام غزالی' امام رازی' امام شاطبی اور شاہ ولی اللہ دہلوی وغیرہ کی تحریروں میں ملتے ہیں۔

دور جدید میں اس کام کی اہمیت اور پیچیدگی پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ پہلے مبارزت صرف ایک میدان میں تھی' یعنی فلسفہ' منطق اور عقلیات کا میدان۔ اب یہ مبارزت زندگی کے ہر میدان میں ہے۔ فلسفہ اور انسانی علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے مظاہر تک' آج ہر قدم پر دنیائے اسلام کو بیرونی اور خارجی قوتوں سے قدم قدم پر نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ان میں سے بعض مقامات میں یہ نبرد آزمائی "سستا" زیادہ اہم اور فوری نوعیت کی ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ ملت مسلمہ ان معاملات کے بارہ میں فوری طور پر اپنے کو صف آراء کرے اور اپنے وسائل و اسباب کو کماحقہ استعمال کرے۔ ان اہم اور فوری امور میں ایک انتہائی اہم مسئلہ قانونی' دستوری اور عدالتی معاملات کا ہے۔ اس میدان میں مغربی تصورات و افکار کے تسلط اور غلبہ نے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو متاثر بلکہ ماؤف کر دیا ہے کہ یہ طبقہ اسلام کے تصورات و نظریات کو سمجھنے میں اس طرح مشکل محسوس کرتا ہے جس طرح کوئی بھی مغربی دانشور۔ تاہم یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ دنیائے اسلام میں اس صورت حال کے خلاف ایک شدید رد عمل اٹھتا نظر آرہا ہے جو اگر مثبت اور تعمیری خطوط پر آگے بڑھا تو ایک بڑی خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنے گا۔

اسی رد عمل کا مظہر وہ دلی آرزو ہے جو اسلام کے تصور عدل و احسان پر مبنی معاشرہ کے قیام اور اسلامی تصورات کے عملی نفاذ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں اٹھتی نظر آتی ہے۔ اسی آرزو کی تکمیل کے انتظار میں آج لاکھوں گردنیں کٹ رہی ہیں' لاکھوں گھر اجڑ رہے ہیں' کتنے ہیں جو گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں اور کروڑوں دل ہیں جو اس دیرینہ خواب کی تعبیر کی تمنا میں دھڑک رہے ہیں۔ لیکن اس خواب کی تعبیر اس قدر آسان نہیں ہے جتنا ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر ایک طویل سفر کی متقاضی ہے۔ ایسا طویل سفر جس کی پہلی منزل' ایک فکری تبدیلی' ایک تعلیمی تحریک اور ایک ذہنی

انقلاب سے عبارت ہے ۔ جب تک اسلام کے تصورات و تعلیمات پر گہرا ایمان رکھنے والی' دور جدید میں ان کو روبہ عمل لانے کے جذبہ سے سرشار اور اس راہ کی مشکلات سے کلی طور پر آگاہی اور ادراک رکھنے والی نسل وجود میں نہیں آئے گی اس وقت تک اس خواب کو حقیقت کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس پہلی منزل کا پہلا قدم اسلامی فقہ اور قانون کی کماحقہ تعلیم و تدریس اور اس سلسلہ میں ضروری مردان کار کی تیاری کا کام ہے۔ ایسے مردان کار جو اسلامی فقہ کو اس کے بنیادی ماخذ و مصادر سے براہ راست سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جن کو رائج الوقت قانونی' دستوری' اور عدالتی تصورات سے گہری لیکن ناقدانہ واقفیت حاصل ہو' جو شریعت کی حقانیت اور صلاحیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں اور دور جدید میں اس کی تعلیمات کو روبہ عمل لانے کا مومنانہ جذبہ رکھتے ہوں۔ ایسے افراد کی تیاری وقت کی وہ اہم ضرورت ہے جس کو ہماری ملی ترجیحات میں ابھی تک وہ جگہ حاصل نہیں ہوئی جو اس کو ہونی چاہیے تھی۔

بلاشبہ ہمارے بہت سے دینی اداروں اوراسلامی تعلیم کے مراکزمیں فقہ کی تدریس و تحقیق کا کام ہو رہا ہے اور فقہی موضوعات پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ سب کچھ قطعاً" ناکافی ہے۔ اس تعلیم و تحقیق کاہمارے قانونی نظام اور دستوری اداروں پر اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ملک میں نفاذاسلام کے کام میں پیش رفت نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی شریعہ اکیڈمی اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قائم کی گئی۔ اکیڈمی نے وکلاء اور ارکان عدلیہ کے تربیتی پروگراموں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم کیا جس کے تحت اردو اور انگریزی میں مختلف موضوعات پر جدید انداز سے اسلامی قوانین کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کی اشاعت کے ایک طویل المیعاد منصوبے کا آغاز کیا گیا ہے۔ تصنیف و تحقیق اور نشر و اشاعت کے اس طویل منصوبہ کے ساتھ ساتھ اکیڈمی نے آج سے چند سال قبل ایک شعبہ ایسا بھی قائم کیا جہاں فاصلاتی تعلیم کے اصولوں کے تحت فقہ اسلامی کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری یہ متواضعانہ پیش کش مقبول ہوئی اور اللہ رب العزت نے اپنی بے پایاں نعمت اور لامتناہی فضل سے ہماری اس کاوش کو کامیابی سے نوازا اور ہم تین سال کی مختصر مدت میں اس کورس کے ذریعہ پاکستان اور بیرون پاکستان کے کوئی ڈیڑھ ہزار افراد تک اسلامی قانون اور فقہ کی ایک مربوط اور جامع تصویر پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔

زیر نظر کورس وکلاء ' طلبہ قانون اور عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے ہے۔ اس کا دورانیہ ایک سال ہے اور یہ چوبیس اسباق یا یونٹوں پر مشتمل ہے جن میں فقہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق میں تدریسی مواد کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مطالعہ قانون اسلامی کے اس ابتدائی کورس کے بعد چار دوسرے کورس بھی تیار کرائے جارہے ہیں جو فقہ اسلامی کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ہمارے ان "ایڈوانس کورسز" کی تیاری کا کام جاری ہے اور جلد ہی ہم ان کو بھی شروع کر دیں گے۔

کچھ اس یونٹ کے بارہ میں

اس سے قبل ایک یونٹ "اسلام کا تصور جرم و سزا" کے عنوان سے اسلام کے فوجداری قانون کا بنیادی خاکہ پیش کیا جا چکا ہے۔ موجودہ یونٹ اسی گفتگو کا تتمہ ہے جس میں گزشتہ یونٹ میں بیان کیے گئے موضوعات کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیر نظر یونٹ کے موضوعات اکثر و بیشتر وہی ہیں لیکن ان کا بیان اور موضوعات و مضامین کی تقسیم مختلف انداز میں کی گئی ہے اور بحث کے تمام پہلو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے' مقصد یہ ہے کہ قارئین کے ذہنوں میں اسلام کے فوجداری نظام کے بارہ میں کوئی الجھن نہ رہے' اسلام کا فوجداری قانون علوم اسلامیہ کے ان موضوعات میں سے ہے جن پر وطن عزیز کے کچھ لوگ بعض الجھنوں کا شکار ہیں' بعض لوگ اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی فوجداری نظام کی سزائیں بہت سخت ہیں' کچھ اور لوگ ایسے ہیں جو خود تو کوئی رائے نہیں رکھتے لیکن اسی طرح کے منتشر اور پراگندہ خیال کو دہراتے رہتے ہیں۔

یونٹ کی ابتداء میں سات حدود ------حد زنا' حد قذف' حد شراب نوشی' حد سرقہ' حد حرابہ' حد ارتداد' حد بغاوت------ اور ان کے متعلقات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ حدود کے بعد قصاص اور دیت جیسے دو اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ دونوں موضوعات رائج الوقت ملکی قانون کا حصہ بھی ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ ان کا تذکرہ قانون دان حلقوں کے لیے دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہو گا۔ اسلامی نظام جرم و سزا کا ایک اہم اور معتدبہ حصہ تعزیری سزاؤں سے بھی عبارت ہے۔ یہ وہ سزائیں ہیں جو نہ تو حدود کے زمرے میں آتی ہیں اور نہ ان کا تعلق قصاص و دیت سے ہے۔ ایسی سزاؤں کا تعین و اجراء قاضی یا امام کے ذمہ ہے۔ تعزیری سزاؤں کا دائرہ بے حد وسیع ہے جس کا انحصار رسم و رواج' عرف اور حالات و زمانہ کی رعایت سے ہے۔ ان سزاؤں کا تعلق جرم اور اس کی نوعیت سے ہوتا ہے' بسااوقات ان کا اجراء قاضی کے دائرہ اختیار میں آتا ہے' کبھی یہ پارلیمنٹ کے ذریعے نافذ ہو سکتی ہیں اور کبھی ان کا نفاذ کسی انتظامی مشینری کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ موجودہ یونٹ میں چند ممکنہ سزائیں جیسے قتل' تازیانہ' قید' علاقہ بدری اور جرمانے کا تذکرہ کیا گیا ہے' یہ فہرست حتمی نہیں ہے' حالات و زمانہ کی رعایت سے اس میں ترمیم و اضافہ ممکن ہے۔ سزاؤں کے سلسلے کی آخری کڑی میں بعض غیرروایتی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں مزید مطالعہ کے لیے بعض مفید کتب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ اسلام کا فوجداری قانون علوم اسلامیہ کے ان موضوعات میں سے ہے جن کے بارہ میں سوچنے سمجھنے والا طبقہ بعض الجھنوں کا شکار ہے۔ یہ یونٹ انہی الجھنوں کو رفع کرنے کے لیے ایک حقیر سی کوشش ہے جس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آگے چل کر یہ حقیر سی کوشش شاید کوئی بڑا فکری تموج پیدا کرنے کا باعث ہو۔ مزید برآں اگرچہ اب

ہماری عدالتوں اور کچہریوں میں یہ موضوعات عام ہو چکے ہیں لیکن ان کے بارہ میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اسی لیے قانون دان اصحاب کے لیے زیر نظر کورس کا یہ یونٹ خاص طور پر مفید ہو گا۔

اہل علم سے توقع ہے کہ ہماری اس کوشش پر خیرخواہی اور اصلاح کے جذبہ سے تنقیدی نظر ڈال کر اپنے ملاحظات، تاثرات اور آراء سے ہمیں بھی آگاہ کریں گے تاکہ ان کی روشنی میں ہم دوسرے سلسلہ ہائے خط و کتابت کے معیار کو مزید بہتر بنا سکیں۔

۶ جمادی الاخر ۱۴۱۸ھ

۹ اکتوبر ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اسلام کا فوجداری قانون

تمہید

گزشتہ باب میں اسلام کے تصور جرم و سزا کے بارے میں کچھ تمہیدی باتیں بیان کی گئی ہیں جو اسلام کے فوجداری قانون کی بنیادیں ہیں اور انہی سے اسلام کا فوجداری نظام وجود میں آتا ہے۔ بالاختصار بیان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے فوجداری قانون کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- حدود

۲- قصاص و دیت

۳- تعزیرات

اسلامی نظام زندگی میں انسانی افعال کے نتیجے میں جو جرائم وضع ہو سکتے ہیں وہ بالآخر انہی تین زمروں میں شمار کیے جاتے ہیں' ان میں سے حدود تو طے شدہ ہیں۔ قصاص اور دیت بھی چند مخصوص موضوعات سے عبارت ہیں' لیکن تعزیرات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ قتل کی سزا جاری کرنے کے لیے کچھ شرائط ہیں' کچھ دوسرے ضمنی پہلو ہیں اور بس! کیونکہ اس فعل کا نتیجہ ایک ہی ہے جو ایک انسانی جان کا اتلاف ہے۔ قصاص و دیت کے معاملہ میں بھی یہی ہے لیکن جہاں تک تعزیر کا تعلق ہے تو جرائم اور انسانی افعال سینکڑوں ہزاروں سے بھی بڑھ سکتے ہیں۔ سرکاری خزانہ سے غبن' بد زبانی' فرائض منصبی ادا کرنے میں کوتاہی' بیت المال کا دیدہ و دانستہ غلط استعمال' اختیارات کا غلط استعمال' جعلی سکوں اور نوٹوں کا اجراء' جنگلی حیات کو خلاف قانون ختم کرنا' جنگلات کی غیر قانونی کٹائی اور صحت و صفائی اور ماحول سے متعلق بہت سے افعال ایسے ہیں جن کے بارے میں قرآن و سنت نے قانون سازی کی اجازت دی ہے اور ان امور میں ریاست کو یہ اختیار تفویض کیے ہیں کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق قانون سازی کرے۔ اس لیے تعزیری سزائیں بہت سی ہو سکتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اللہ حکیم نے فی الحقیقت بہت تھوڑے امور میں سزائیں مقرر کی ہیں جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف لاتعداد امور میں قرآن و سنت نے امام کو یہ اختیار دیا کہ وہ قرآن و سنت کے مجموعی احکام کی روشنی میں خود فیصلہ کرے۔ امام کے اس فیصلے پر قرآن و سنت نے بعض تحدیدی احکام لاگو کیے ہیں مثلاً **اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ** (نحل' ۱۶ - ۹۰) "اللہ تمہیں عدل کرنے کا حکم دیتا ہے" اسی طرح فرمایا **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (شوریٰ' ۴۲ - ۳۸) "اور ان (مسلمانوں) کے معاملات باہم مشورے سے طے پاتے ہیں۔"

ان امور میں اللہ کی طرف سے یہ اصولی راہنمائی ہے جس کے تحت امام کے صوابدیدی اختیارات عدل کے ساتھ مشروط ہیں۔ سربراہ مملکت کے جاری کردہ قوانین' احکام اور فیصلے عدل سے خالی ہوں تو یہ صوابدیدی اختیارات کا غلط استعمال ہے جس کے لیے اللہ کا فرمان ہے۔ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ** (مائدہ' ۵ - ۴۵) "اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"

یہ فرمان حدود اور قصاص و دیت کے بارے میں ہے مگر اپنے عمومی مفہوم کی وجہ سے مذکورہ بالا دو فرامین الٰہی کا احاطہ بھی کرتا ہے جس میں عدل کا حکم اور معاملات طے کرنے کے لیے مشورے کی ترغیب دی گئی ہے۔ عدل کا حکم اللہ کی طرف سے ہے' اس لیے مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے کر ریاستی امور تک باہم مشورے سے چلانا ضروری ہے۔ اب اگر کسی مملکت میں ان دو امور کا اہتمام نہیں ہوتا' عدل کی بجائے ظلم اور مشورے کی جگہ مطلق العنانیت ہو' تو کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں ظالموں کا راج ہے کیونکہ اللہ کے نازل کردہ احکام (عدل اور مشاورت) کے برعکس طریقے سے امور مملکت چلائے جا رہے ہیں۔

تعزیرات کے بارے میں احکام الٰہی خاموش ہیں اور اس باب میں ریاست کو قانون سازی کا مکمل اختیار ہے۔ یہ اختیار بلاتحدید نہیں بلکہ بعض شرعی احکام سے مربوط ہے' یہاں بھی مطلق العنانیت کا تصور نہیں ملتا۔ کوئی سرکاری اہل کار بیت المال سے کچھ رقم غبن کرے تو اس پر کوئی حد نہیں ہے کیونکہ قطع ید کی شرائط پوری نہیں ہوتیں۔ اس جرم پر سزا دینے کا حتمی اختیار امام کو ہے' یہ اختیار عدل سے مشروط ہے۔ امام کی طرف سے سزا کا تعین باہم مشاورت سے مشروط ہے۔ عدل کا تقاضا ہے کہ غبن کی گئی رقم کے مطابق سزا دی جائے جس کو عقل تسلیم کرے' اب رقم تو معمولی ہو لیکن سزا دی جائے تاحیات قید بامشقت! تو اس کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔

قرآن ہمیں جزا کے تصور پر بالخصوص ایک رہنما اصول بھی بتاتا ہے جو تعزیری سزاؤں کے ضمن میں اہم ہے' فرمان الٰہی ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ' ۴۲: ۴۰)

اور برائی کا بدلہ اسی برائی کے مثل ہے۔

یہاں برائی کا بدلہ برائی مثل ہے' نہ کہ برائی کا بدلہ برائی۔ مثل سے مراد یہ ہے کہ برائی کا جتنا حجم ہو اسی کا بدلہ لیا جائے نہ کہ اللہ کے حرام کردہ افعال کا بدلہ ان جیسے حرام افعال کی صورت میں لیا جائے۔ کوئی شخص کسی جائیداد کو نقصان پہنچائے تو مجرم کے مال سے نقصان کی تلافی کر دی جائے۔ کوئی شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت

گھس جائے تو اس کی سزا مقرر کرنا امام کے ذمہ ہے جو اس جرم کی نوعیت کے مطابق عدل اور مشاورت کے ذریعے اس کے مثل سزا دے سکتا ہے' یہ نہیں ہو سکتا کہ مجرم کی چار دیواری کے تقدس کو اسی طرح پامال کیا جائے جس طرح اس نے جرم کیا ہو۔ اس لیے جرم کے مثل سزا سے مراد اس ملتی جلتی سزا ہے نہ کہ اسی فعل کا ارتکاب جس کا مجرم مرتکب ہو چکا ہو۔ تعزیرات کے نفاذ میں یہ اصول بہت اہم ہے۔

امام کے صوابدیدی اختیارات کو اللہ نے جہاں ایک طرف عدل' مشاورت اور جرم سے مطابقت کے ساتھ مشروط کیا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ جرم کرنے والا ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہے' یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی سزا برداشت کرے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر ۳۵: ۱۸)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

گزشتہ آیات کی طرح یہ آیت بھی اپنے عمومی حکم کے باعث حدود اور قصاص و دیت کا احاطہ کرتی ہے۔ نیز اپنے عمومی حکم ہی کی وجہ سے تعزیرات بھی اس کی ذیل میں آتی ہیں۔ جس طرح حدود اور قصاص و دیت میں مجرم ہی سے بدلہ لیا جاتا ہے اسی طرح تعزیرات کے مقدمات میں سزا بالآخر مجرم ہی کو دی جاتی ہے' نہ کہ اس کی جگہ کسی دوسرے کو۔ آئندہ سطور میں حدود' قصاص و دیت اور تعزیرات کے بارے میں بعض اہم امور کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

حدود اور ان کے متعلقات

حدود کے بارے میں ابتدائی بحث گزشتہ باب میں ہو چکی ہے۔ عام طور پر کتب فقہ میں جرائم حدود میں زنا' قذف' شراب نوشی' چوری' ڈاکا' ارتداد اور بغاوت شمار کیے جاتے ہیں۔ ان تمام جرائم حدود کے بارے میں اہم نکات بیان کیے جا رہے ہیں۔ تفصیل جاننے کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیجئے۔

۱- زنا

زنا کی تعریف فقہ حنفی میں یوں ہے۔

"ایسی زندہ عورت کے ساتھ' جو نہ ملک اور نکاح میں ہو اور نہ اس کے ساتھ ملک و نکاح کا شبہ پایا جاتا ہو' رحم کی جانب سے مباشرت کرنا زنا کہلاتا ہے"[۲۲]۔

زنا کے بارے میں دوسرے فقہاء کی تعریفیں قدرے ناقص ہیں' مثلاً مالکی فقہاء کے ہاں اس سے مراد "ہر وہ

مباشرت ہے جو نکاح صحیح میں ہو' نہ شبہ نکاح میں اور نہ ملک یمین میں" اس تعریف میں مباشرت مطلقہ ہے۔ رحم یا مقعد کا ذکر نہیں ہے' در آنحالیکہ ایک فوجداری جرم کا تعین کرنے کے لیے یہ وضاحت ضروری ہے۔ اسی طرح شافعی فقہاء کی زنا کی تعریف بھی اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔ کچھ فقہاء مقعد کے راستے دخول کو بھی زنا میں شمار کرتے ہیں۔ لہٰذا حنفی فقہ کی تعریف کو جامع قرار دیا جا سکتا ہے۔

زنا کا ارتکاب کرنے والے شخص کی دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں۔ جنہیں شرع میں محصن اور غیر محصن کہا جاتا ہے۔ محصن سے مراد وہ شخص ہے جو نکاح صحیح کی حالت میں اپنی بیوی سے مباشرت کر چکا ہو۔ ایسا شخص زنا کا ارتکاب کرے تو اس کے لیے رجم (سنگسار کرنے) کی سزا ہے۔ غیر محصن سے مراد وہ شخص ہے جو مذکورہ بالا شخص کے علاوہ ہو۔ کنوارہ شخص بھی اسی میں آتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ارتکاب زنا پر سو کوڑوں کی سزا ہے۔ ایک رائے کے مطابق کوڑوں کے ساتھ ایک سالہ جلاوطنی کی سزا بھی ہے جسے بعض فقہاء حد میں اور بعض تعزیر میں شمار کرتے ہیں۔ جلاوطنی کا بدل موجودہ زمانے میں سزائے قید ہو سکتی ہے۔

ارتکاب زنا پر مجرم کو اس کی بدلتی ہوئی حیثیت کے مطابق سزا دی جاتی ہے۔ اگر غیر محصن ہو تو سو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے جس کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور ۲۴: ۲)

زانی عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

غیر محصن زانی کے لیے یہ سزا حد پامال کرنے کے نتیجے میں دی جاتی ہے۔ امام شافعی کا خیال ہے کہ اس حد کے ساتھ ایک سالہ جلاوطنی بھی حد کے طور پر دی جانے والی سزا ہے۔ ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوان زانی' مرد و عورت کے لیے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا کا حکم دیا تھا (حدیث عسیف) امام ابو حنیفہ سو کوڑوں کو حد شمار کرتے ہیں۔ لیکن جلاوطنی کو حدیث کے مرتبے کے باعث بطور حد قبول نہیں کرتے بلکہ صحابہ کے عمل کی وجہ سے سزا کو تعزیر شمار کرتے ہیں۔ اس لیے امام شافعی کی رائے کو اختیار کیا جائے تو قاضی زنا کے مقدمے میں غیر محصن مجرم کو لازماً سو کوڑوں کی سزا اور ایک سالہ جلاوطنی کی سزا دے گا' امام ابو حنیفہ کی رائے پر عمل کیا جائے تو سو کوڑوں کی سزا لازماً دی جائے گی لیکن جلاوطنی کی سزا قاضی کی صوابدید پر ہے۔ حالات و واقعات کے مطابق وہ چاہے تو یہ سزا دے اور چاہے تو موقوف کر دے۔ شادی شدہ زانی کے لیے اس فعل کی سزا سنگسار کرنا ہے۔

زنا پر مذکورہ بالا حد کی تفہیم آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے اسلامی شریعت کا مجموعی مزاج پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ خیال بھی رکھنا اہم ہے کہ نفاذ حد کے لیے ایک مکمل اسلامی معاشرے کا وجود بھی ضروری ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ مکمل اسلامی معاشرے کا انتظار نہ کیا جائے اور اسلامی شریعت نافذ کرنے کے لیے ان تینوں پہلوؤں کے بین بین کوئی متبادل راستہ نکالا جائے۔ اس تمہید کے بعد جو بات بیان کرنا پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ اسلام' معاشرے سے جرائم اور سزاؤں کے وجود ہی کو ختم کرنے کے لیے کوشاں نہیں' ان سلبی موضوعات کے تذکرے میں بھی احتیاط پسند کرتا ہے۔ اب اسی زنا کی سزا کو لیجیے' دنیا کے ہر قانون میں تمام جرائم دو گواہوں کی گواہی کے ساتھ ثابت ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ جرم زنا کے لیے چار گواہوں کی شرط ہے؟ نہ صرف یہ بلکہ ان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو جرم کا الزام لگانے والا خود قذف کا مرتکب ٹھہرتا ہے' باوجود اس حقیقت کے کہ تینوں گواہ عادل اور نیک سیرت ہوں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے شریعت کا مزاج اول تو اس جرم کی طرف جانے والے تمام راستوں کو بند کرتا ہے۔ اس کے بعد اسلامی معاشرہ لوگوں کی جائز صنفی ضروریات پوری کرنے کے لیے نکاح کا راستہ آسان کرتا ہے۔ پھر اس جرم کے سدباب کے لیے اسلامی معاشرت کی مضبوط فصیل کچھ ایسا بندوبست کرتی ہے کہ خواہش مند خواتین و حضرات کے لیے اس کا ارتکاب آسان نہ ہو' قانونی نظام کے ساتھ ساتھ ایمانیات کے دائرے میں شریعت اسلامی لوگوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتی ہے۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود کہیں نہ کہیں اس جرم کا واقع ہو جانا بعید از قیاس نہیں' اس صورت میں بھی اسلام کا اخلاقی نظام بے حیائی کے اس تذکرے کی اشاعت کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ زبان کی لذت' ذہنی چٹخارے اور بے حیائی کے جا بے جا تذکرے کی اسلامی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جرم کے ثبوت کے لیے چار عادل مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ یہ شرط رضامندی سے کیے گئے فعل زنا کے لیے ہے۔ زنا بالجبر کا موضوع تفصیل کا تقاضا کرتا ہے۔ تفصیلات کے لیے کتب فقہ کا مطالعہ کیجیے۔

۲- قذف

لغوی طور پر قذف سے مراد پھینکنا ہے[۲]۔ اصطلاحی معنوں میں یہ لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ کسی پر کوئی شے پھینکنا قذف ہے۔ یعنی کوئی الزام پھینک کر کسی کی شخصیت داغ دار کرنا قذف کہلاتا ہے۔ اصطلاحاً قذف سے مراد زنا کا الزام لگانا ہے۔ قذف کی سزا قرآن سے ثابت ہے' فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً

وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (نور، ۲۴: ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔

اس آیت میں پاک دامن عورتوں کا ذکر ہے۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ تہمت زنا پاک دامن مردوں پر لگائی جائے تو بھی موجب حد ہے۔ مرد و زن کی اس باب میں کوئی تفریق نہیں ہے۔

قاذف کو سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں دو اوصاف پائے جائیں۔ اول یہ کہ وہ بالغ ہو اور ثانیاً عاقل ہو، مجنون نہ ہو۔ مرد و زن، یا مسلم غیر مسلم کی کوئی قید نہیں[۳]۔ مقذوف (جس پر تہمت لگائی جائے) میں جب تک پانچ اوصاف نہ ہوں، قاذف پر حد نافذ نہیں ہو سکتی۔ یہ اوصاف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بلوغ (مقذوف بالغ ہو)

۲۔ حریت (آزاد ہو، غلام نہ ہو)

۳۔ پاک دامنی (یعنی واقعی زانی نہ ہو)

۴۔ اسلام (غیر مسلم پر الزام لگایا جائے تو قاذف مستوجب حد نہیں)

۵۔ زنا کرنے پر قادر ہو یعنی صنفی عمل کی صلاحیت رکھتا ہو۔

ان میں سے کوئی شرط بھی کم ہو تو حد نافذ نہ ہو گی، اس صورت میں قاضی تعزیری سزا دے سکے گا۔ تمام شرائط مکمل ہو جائیں تو قرآنی حکم کے ماتحت قاذف کو اسی کوڑوں کی سزا دی جائے گی، اس سلسلے میں نہ اجتہاد کار آمد ہے اور نہ ریاست یا قاضی کے صوابدیدی اختیارات، بلکہ قرآن کے حکم کے مطابق ہی عمل ہو گا۔

کوڑوں کی سزا کے بعد مجرم کے لیے ایک اخلاقی سزا بھی ہے جو قاذف کی شخصیت پر نافذ کی جاتی ہے نہ کہ اس کے جسم پر۔ وہ سزا یہ ہے کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے قاذف کی شہادت قبول نہ کی جائے، یہ ایسے افراد کا اخلاقی اور معاشرتی بائیکاٹ ہے۔ آیت کے اگلے حصے میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کر لیں ان کے لیے استثناء ہے۔ یہ استثناء سزا میں معافی کے لیے نہیں ہے بلکہ کوڑوں کی سزا تو جرم ثابت ہونے کے بعد ہر حال میں نافذ ہو گی۔ شہادت کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ جمہور فقہاء کا کہنا ہے کہ توبہ اور اپنی اصلاح کے بعد قاذف کی شہادت قبول ہو سکتی ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے کہ استثناء کا جواز اسی آیت کے اگلے ٹکڑے میں ملتا ہے جس کا مکمل مفہوم یوں ہے کہ "سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں تو اللہ

ضرور (ان کے حق میں) غفور و رحیم ہے"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ توبہ اور اپنی اصلاح کرنے والے کا تعلق اللہ کی مغفرت و رحمت سے ہے۔ رہے دنیاوی معاملات تو احتیاط کا تقاضا ہے کہ ایسے شخص کو سزا کے طور پر شہادت دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے تاکہ معاشرے کا ہر فرد زبان کے استعمال میں احتیاط سے کام لے۔ غالباً یہی رائے اقرب الی صواب ہے۔

یہی اختلاف مقذوف کی طرف سے معافی کی صورت میں بھی ہے۔ امام ابو حنیفہ کا خیال ہے کہ قذف کی سزا قابل معافی نہیں کیونکہ یہ حدود اللہ میں سے ہے۔ اس لیے معاف کرنا روا نہیں۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ مقذوف معاف کر دے تو قذف کی حد ساقط ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ کا نقطہ نظر ان دونوں آراء کے بین بین ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حاکم کو قذف کی اطلاع مل جائے تو مقذوف کو معافی کا اختیار نہیں رہتا۔ حاکم کو اطلاع ہونے سے پہلے پہلے معاملے کو باہم سلجھا لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کی یہ رائے غالباً سرقہ کے ایک معاملہ پر رسول اللہ ﷺ کے ایک فیصلہ پر قیاس ہے جس میں ایک شخص نے دوسرے کی کوئی شے چرا لی۔ وہ اپنا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گیا' انہوں نے ملزم کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ سن کر مدعی نے اپنا مقدمہ واپس لینے کی درخواست کی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' اگر تم میرے پاس آنے سے قبل اسے معاف کر دیتے تو ممکن تھا' اب ممکن نہیں۔ غور کیا جائے تو یہ رائے امام ابو حنیفہؒ کی رائے کی تشریح ہی معلوم ہوتی ہے اور آج کل اسے اپنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳۔ شراب نوشی

شراب شرعاً" حرام ہے۔ شراب نوشی پر فوجداری مسئولیت ہے۔ قرآن میں اس کی حرمت ان الفاظ میں ہے

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (مائدہ' ۵: ۹۰)

یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے اجتناب کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔

اس آیت میں شراب کی مجرد حرمت کا ذکر ملتا ہے۔ سزا کے بارے میں قرآن خاموش ہے جس کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عمل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ شراب ایک تدریجی عمل کے ذریعے حرام قرار پائی۔ اس عمل سے اس وقت کے مسلمانوں کی خوب تربیت ہو چکی تو صراحتاً" حرمت کے احکام نازل ہوئے۔ اس

کے بعد شراب پینے والے افراد نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ کوئی اکا دکا واقعہ ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اسے ایسی سزا دیتے جس سے انتہائی جسمانی ایذا کی بجائے سرزنش اور ملامت کا عنصر زیادہ ملتا۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایسے ہی ایک شخص کو آپ ﷺ کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے حکم دیا' اسے ضربیں لگاؤ۔ ہر فرد نے اپنے اپنے طریقے سے اسے پیٹنا شروع کر دیا' کوئی مکے تھپڑ مارنے لگا' کسی نے جوتوں سے مارا[۴]۔ ایک دوسرے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ شراب پینے والے کو ملامت کریں۔

ایسی تمام روایات جمع کرنے کے بعد بعض صحابہؓ نے یہ نتیجہ نکالا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جرم کی سزا چالیس کوڑے دی تھی۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں باقاعدہ چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی جو بعد میں اس جرم کے کثرت سے ہونے کے باعث اسی کوڑے کر دی گئی[۵]۔ دوسری تمام نشہ آور اشیاء بھی اسی ضمن میں آتی ہیں اور ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کے بعض پہلو تفصیل طلب ہیں جن کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

شراب سے متعلق بعض تعزیری سزائیں بھی ہیں اور یہ جرم کے کم حجم کی وجہ سے ہیں۔ شراب کی تیاری' نقل و حمل اور تجارت یہ سب جرم ہیں۔ اس لیے تیاری کے عمل میں شریک کارکن' خرید و فروخت کے عمل میں شریک افراد اور نقل و حمل کے ذمہ دار افراد یقیناً سزا کے مستحق ہیں۔ یہ سب افراد شراب مہیا کر کے لوگوں کے لیے شراب نوشی کے مواقع فراہم کرتے ہیں' خود شراب نوشی نہیں کرتے اس لیے ان پر حد تو نافذ نہیں ہو سکتی لیکن حالات و زمانہ کی رعایت سے یہ لوگ تعزیری سزا کے مستحق ہیں۔ تعزیری سزا کا تعین امام کے ذمہ ہے۔

۴- چوری

چوری کے لیے سرقہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ فقہاء نے اس کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:-

۱- چوری عاقل و بالغ شخص سے سرزد ہو' عورت مرد' مسلم غیر مسلم کی کوئی قید نہیں۔

۲- چوری کی جانے والی شے خفیہ طریقے سے لی جائے' علی الاعلان اور دھونس سے لی جانے والی شے چوری کے زمرے میں نہیں آتی۔ اس کے لیے دوسری اصطلاحیں موجود ہیں۔

۳- چوری دوسرے کے مال کی ہو۔ اگر مال کے بارے میں شبہ یا یقین ہو کہ اس میں خود چور کا حصہ بھی ہے تو یہ چوری موجب حد نہیں' موجب تعزیر ہے۔

۴- چوری کے مال کی مقدار معین ہو' نصاب سے کم مال کی چوری پر تعزیر ہو سکتی ہے۔

۵- چوری کا مال کسی محفوظ جگہ (حرز) سے حاصل کیا جائے۔ حرز وہ جگہ ہے جہاں سے عام حالات میں

شے لے جانا ممکن نہ ہو، جیسے گھر وغیرہ جہاں تالا لگا ہوا ہو۔ کھیت، کھلیان، باغات، نہریں اور اس طرح کے کھلے مقامات حرز کی ذیل میں نہیں آتے۔

۶- چوری کیا جانے والا مال متقوم (قابل قدر یعنی قیمت رکھنے والا) ہو۔ مال متقوم سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں آزادانہ طور پر خریدا بیچا جاتا ہو۔ شراب (جو مسلم کے قبضے میں ہو) آلات موسیقی اور دیگر حرام اشیاء کی چوری پر حد نافذ نہیں ہو سکتی[۶]۔

۷- مال جلد خراب ہونے والا نہ ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ ذخیرہ کیا جا سکتا ہو۔

چوری کے جرم پر قرآن کے الفاظ یوں ہیں۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (مائدہ ۵: ۳۸)

چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔

فقہاء کا اس پر کامل اتفاق ہے کہ مندرجہ بالا تمام شرائط پوری ہو جائیں تو چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ہاتھ کاٹنے کے مقام کے بارے میں البتہ اختلاف ہے۔ مال سرقہ کی مالیت کے بارے میں ایک روایت ہے کہ چوتھائی دینار سے کم مال کی چوری پر حد نہیں ہے (ابو داؤد)۔ حد سرقہ نافذ کرنے کے بارے میں چند اہم نکات کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱- نابالغ اور پاگل پر حد نافذ نہیں ہو سکتی۔

۲- جہاں سے مال چوری کیا گیا ہو وہ جگہ اسلامی ریاست میں واقع ہو، اس کے علاوہ کسی مقام سے مال چوری کیا جائے تو موجب حد نہیں۔ حتیٰ کہ اسلامی ریاست کے کسی حصہ پر باغیوں نے شورش بپا کر رکھی ہو اور اس حصہ میں چوریاں عام ہوں تو بھی حد نافذ نہیں کی جائے گی۔

۳- بیت المال سے چوری پر حد نہیں کیونکہ چرایا گیا مال (Public Money) عوام کا ہے جس میں خود چور کا حصہ بھی ہے اگرچہ بہت معمولی ہی سہی۔

۴- بعض فقہاء کے نزدیک نفاذ حد کے لیے ضروری ہے کہ مال مسروق، محفوظ جگہ تک پہنچایا جائے۔ پس ایک آدمی محفوظ مکان سے مال باہر پھینک دے اور اس کا ساتھی اٹھا کر محفوظ ٹھکانے پر لے جائے تو دونوں واجب الحد نہیں ہیں، انہیں تعزیری سزا دی جائے گی۔

۵ - حاکم تک چوری کا مقدمہ پہنچ جائے تو قابل راضی نامہ نہیں' اس سے قبل مدعی چور کو معاف کر سکتا ہے۔

۶ - چوری ثابت کرنے کے لیے ملزم کا اقرار یا دو عادل مردوں کی شہادت کافی ہے۔

۷ - چوری کیا گیا مال بھی چوری کا ہو تو حد نافذ نہ ہو گی بلکہ کوئی تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔

۵ - حرابہ اور مسلح ڈکیتی

قرآن میں اس جرم کے لیے محاربہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کے اصل الفاظ پیش نظر رکھ کر مفہوم اخذ کیا جائے۔ فرمایا!

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ ۵ : ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں' ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں' یا سولی پر چڑھائے جائیں' یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں' یا وہ جلا وطن کر دیئے جائیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اسلامی ریاست میں اسلحہ کے ذریعے داخلی شورش کا باعث بنتے ہیں۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ اس آیت کا شان نزول وہ واقعہ ہے جس میں بعض لوگ مرتد ہو گئے تھے۔ جمہور فقہاء کی رائے اس کے برعکس ہے' ان کے خیال میں اس آیت میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو مسلح ڈکیتی اور رہزنی کا ارتکاب کریں۔ جمہور اپنے موقف کی تائید میں اسی آیت **اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا** (سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کر لیں) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ توبہ کی نسبت مسلمان ہی کی طرف ہو سکتی ہے' غیر مسلم کے بارے میں توبہ کی اصطلاح استعمال کرنا بے محل ہے۔

بیشتر علماء نے جمہور فقہاء ہی کے موقف کو لیا ہے۔ اس لیے اب محاربہ میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اسلامی ریاست سے بر سر پیکار ہوں اور زمین میں فساد پھیلائیں' یا مسلح جدوجہد کریں۔ ڈاکو' مسلح ڈکیتی کرنے والے' دہشت گرد' بموں کے دھماکے کرنے والے' ٹرینوں کی پٹڑیاں اکھاڑنے والے' جہاز اغوا کرنے والے' اغوا برائے تاوان کے مجرم اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والے تمام افراد اسی زمرے میں آتے ہیں۔

اس جرم میں مدعی اسلامی ریاست ہوتی ہے' اس لیے ملزم کسی کو قتل کر دے اور مقتول کے ورثاء قاتل کو

معاف کر دیں تو بھی اس کی جان بخشی نہیں ہو گی کیونکہ اس معاملہ میں فی الاصل جنگ مقتول کے ساتھ نہیں ریاست یا اس کے باشندگان کے خلاف بحیثیت مجموعی ہوتی ہے۔ اس مقدمہ میں ایک مدعی یقیناً مقتول کے ورثاء بھی ہو سکتے ہیں لیکن انہیں معافی حاصل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اصل مدعی یعنی اسلامی ریاست کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے کیونکہ اس جرم کی سزا اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔

اس جرم کے ارتکاب پر شریعت اسلامیہ نے چار سزائیں مقرر کی ہیں' قتل' پھانسی' مخالف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹنا یا ملک بدر کرنا۔ تمام سزائیوں کے بعد "اَوْ" بمعنی 'یا' کی وجہ سے فقہاء میں اختلاف ہے[۸]۔ امام شافعی' ابو حنیفہ اور فقہاء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ تمام سزائیں دوسری فوجداری سزاؤں کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں' اس لیے صرف اسی محارب کو قتل کیا جائے گا جس نے کسی کو قتل کیا ہو' اسی طرح قطع ید وغیرہ کی سزا اسی محارب کے لیے ہے جس نے ڈاکے کے ذریعے لوٹ مار کر کے کسی کا مال عملاً چھینا ہو۔ ملک بدری کی سزا اس محارب کے لیے ہے جس نے کسی کو قتل کیا ہو' نہ مال لوٹنے میں کامیاب ہوا ہو بلکہ محض فساد کا باعث بنا ہو۔ ان فقہاء کا خیال ہے کہ یہاں لفظ "اَوْ" ایک بات مکمل کر کے دوسری شروع کرنے پر استعمال کیا گیا ہے۔ امام مالک کا خیال ہے کہ "او" اختیار (Discretion) کے معنوں میں آیا ہے۔امام کو اختیار ہے کہ وہ کوئی سی سزا دے' لیکن امام مالک بھی امام کے مطلق اختیار کے قائل نہیں' ان کے خیال میں یہ اختیار قتل اور پھانسی پر لٹکانے میں سے ایک یا دونوں کی حد تک ہے' اسی طرح محاربین محض خوف و ہراس پیدا کریں تو امام انہیں ملک بدر کر سکتا ہے اور چاہے تو معاف کر دے لیکن قتل یا باقی دو سزائیں نہیں دے سکتا۔ فقہاء کا ایک تیسرا گروہ امام کے مطلق اختیار کا قائل ہے۔ ان کے خیال میں آیت میں مطلق اختیار دیا گیا ہے' وہ چاہے تو کوئی بھی سزا نافذ کر سکتا ہے۔ بدلتے حالات اور زمانہ کی رعایت سے یہ آخری سزا قدرے مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جرم کی اساس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کو مطلق اختیار(Free Hand) دیا جائے تاکہ وہ جرم کے مطابق فیصلہ کرے۔ فساد فی الارض ایسی اصطلاح ہے جس کا حصر آسان نہیں' اس لیے اس آیت میں امام کو ان چاروں سزاؤں سے باہر جانے کے لیے کوئی اختیار نہیں۔ سولی چڑھانے کے عمل سے مقصود دوسروں کو روکنا ہے تاکہ وہ برے افعال سے قبل متنبہ ہو جائیں' قطع سے مراد مجرم کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا ہے۔ توبہ صرف انہیں محاربین کی قبول کی جاتی ہے جو پکڑے جانے سے قبل توبہ کریں' پکڑے جانے کے بعد ان پر سزا نافذ ہو گی۔ جلاوطنی سے مراد بعض کے نزدیک دارالاسلام سے اخراج ہے اور بعض کا خیال ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر ہی قصر کی مسافت پر بھیج دیا جائے گا۔ اس پہلو پر

مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔

۶- ارتداد

ارتداد کا معنی دین اسلام سے پھر جانا ہے۔ اسلام چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرنا شریعت کی نظر میں کفر ہے ارتداد کے احکام دو نصوص سے ثابت ہوتے ہیں' قرآن میں آتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَّهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۲: ۲۱۷)

تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں جان دے گا اس کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے سب لوگ جہنمی ہیں۔ اور ہمیشہ جہنم ہی میں رہیں گے۔

اس آیت میں ارتداد پر اخروی سزا ہے' دنیا میں فوجداری مسئولیت نہیں ہے۔ یہ فوجداری مسئولیت حدیث رسول ﷺ کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من بدل دینہ فاقتلوہ[۹]

جو اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو۔

ایک دوسری حدیث میں جن تین قسم کے افراد کا قتل جائز قرار دیا گیا ہے ان میں ایک مرتد بھی ہے[۱۰]۔ اس مضمون کی یہ واحد حدیث نہیں' کتب حدیث میں اس بارے میں کئی احادیث ملتی ہیں۔ خلافت راشدہ کے ادوار میں مرتدین کے قتل کے ایک سے زائد واقعات بھی ملتے ہیں۔

عہد جدید میں اس مسئلہ کو سمجھنا خاصا دشوار ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگ نہ صرف دین کی روح بلکہ روزمرہ احکام اسلام اور تعلیمات اسلام تک سے ناواقف ہیں۔ آزادی فکر' آزادی رائے حتیٰ کہ آزادی عمل کے دلفریب لیکن بے مقصد نعروں نے لوگوں کا مزاج بگاڑ دیا ہے جو عقل سلیم کی دولت سے محروم اور غور و فکر کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ آج کل جدید تشہیری تکنیک کے ذریعے جس بے قید آزادی کی ترغیب دی جا رہی ہے اس نے نہ صرف معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا ہے بلکہ لوگوں کو دین سے بھی بہت دور کر دیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ چند آداب و قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے آزادی فکر کا سب سے بڑا اور اولین علم بردار خود اسلام ہے مگر اس حد تک کہ معاشرے میں فساد پیدا نہ ہو۔ لوگوں کے امن و سکون میں خلل واقع نہ ہو۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ

معلوم دنیا کے کم و بیش دو تہائی رقبے پر حکومت کرنے والے خلیفہ کو ایک دیہاتی کے احتساب کا سامنا کرنا پڑا تو سوائے وضاحت کے اسے کوئی چارہ کار نظر نہ آیا' دبدبہ کام آیا اور نہ اختیارات! اسی اسلامی ریاست میں وہی خلیفہ ایک بوڑھے ذمی کو بھیک مانگتے دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتا ہے کہ اس کی جوانی سے تو ہم نے ٹیکس حاصل کیا اور بڑھاپے میں بے یارو مدد گار چھوڑ دیا۔ اور اسی آزادی رائے کے تحت اس ایک بوڑھے ہی کے لیے نہیں' اس جیسے تمام ذمیوں کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا اور یوں ان کے عقیدے کا مکمل احترام کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں مدینے کے یہودیوں کو آزادی رائے اور آزادی عمل کا مکمل موقع دیا گیا۔ ان کے شخصی قوانین سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ عہد خلافت راشدہ میں ایک موقع پر خلیفہ وقت کو لوگوں نے متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ سیدھے راستے پر چلتے رہے تو ٹھیک' ورنہ ہم تمہیں خود سیدھا کر دیں گے۔

اسلامی تاریخ میں درجنوں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام آزادی رائے' آزادی اظہار اور آزادی عمل کا نہ صرف حامی ہے بلکہ اس کے پھلنے پھولنے کے لیے مواقع مہیا کرتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دین اسلام چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے والوں کے لیے موت کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک اور آیت میں فرمایا **لااکراہ فی الدین** یعنی "دین میں کوئی جبر (Coercion) نہیں"۔ اس آیت کی روشنی میں اسلام کی عطا کردہ آزادی کو اس آیت کے بظاہر مفہوم سے ملا کر دیکھا جائے تو ارتداد اور اس پر دی جانے والی سزا کا جواز نہیں بنتا لیکن یہ سطحی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ دین میں کوئی جبر نہیں' کو ماقبل کی آیات سے جدا کر کے دیکھا جائے تو یقیناً یہی مفہوم نکلتا ہے۔ اس سے پہلے کی آیات میں اللہ نے پہلے اپنی واحدانیت کا تصور دیا' پھر اپنے بارے میں باطل عقائد کا ابطال کیا' اس کے بعد کائنات کے ایک ایک گوشے پر اپنے اقتدار اعلیٰ کا بیان کیا' پھر اپنے مختار کل ہونے کا اعلان کیا' اور اس سلسلے کے آخر میں اپنی کچھ ایسی صفات کا ذکر کیا جو اللہ کے بارے میں اس وقت کے رائج تصور کو پاش پاش کر رہی تھیں۔ اس تمام بیان کے بعد فرمایا کہ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں کیونکہ صحیح بات غلط خیالات سے الگ کر کے رکھ دی گئی ہے۔ یہ تمام خطاب ان لوگوں سے ہے جو ابھی اسلام کے دائرے سے باہر ہیں' ان کے لیے یقیناً کوئی زبردستی نہیں' جس کی مرضی ہے ان عقائد کو قبول کرے اور پسند نہ آئیں تو اپنے عقیدے پر قائم رہے۔ اس حد تک بلاشبہ دین میں کوئی جبر نہیں' یہاں جبر کے معنی دین اختیار کرنے کے ضمن میں ہیں۔ رہا دین اسلام اختیار کر کے اس کو ترک کرنا تو اس کے لیے یقیناً جبر ہے بلکہ اس جبر سے قبل بھی کئی دوسرے "جبر" ہیں جو اختیار کرنے والوں کے لیے ہیں۔

مثلاً ذرا تصور کیجئے کہ اپنے ماننے والوں کو اسلام اگر کھلی چھٹی دے دے کہ 'دین میں کوئی جبر نہیں' تو معاشرے میں وہ افراتفری دیکھنے میں آئے گی کہ سرے سے دین ہی کی ضرورت نہ رہے گی۔ ہر شخص سود خور ہو گا' مسلمان بھی کہلائے گا اور لا اکراہ فی الدین کی تلاوت بھی کرتا نظر آئے گا۔ قتل و غارت کا بازار گرم کرنے والے اسلام کے فوجداری نظام سے بغاوت کریں گے کہ ہم ہیں تو مسلمان اور اسلام کی حقانیت پر پختہ یقین رکھتے ہیں لیکن اسلام کے فوجداری قانون کی اطاعت اس لیے نہیں کرتے کہ "دین میں کوئی جبر نہیں"۔ قحبہ گری' شراب نوشی' جوا اور دیگر تمام جرائم کے مجرم آزادی رائے کی جدید ہواؤں میں بڑے مزے اور خوش الحانی سے لا اکراہ فی الدین کی تلاوت کرتے نظر آئیں گے اور کہلائیں گے پھر بھی مسلمان!

یقیناً اس نوع کی آزادی کا تصور دنیا کے کسی بھی نظام میں نہیں ہے۔ دنیا کا ہر نظام اپنے مبادیات کے تحفظ کے لیے افراد پر لازماً بعض پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے لیے اتنی سخت سزا کیوں تجویز کرتا ہے۔ اس کی وجہ محض عقیدے کی بحث نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا تصور ریاست جدید تصور ریاست سے قدرے مختلف ہے۔

جدید دنیائے سیاسیات میں ریاست چار عناصر رقبہ' آبادی' حکومت اور اقتدار اعلیٰ سے عبارت ہے۔ ریاست کی تکوین میں اسلام ان عناصر کی شمولیت پر کوئی تعرض نہیں کرتا۔ ایک مفہوم میں اسلامی ریاست یقیناً اسی تعریف کی حامل ہو سکتی ہے بشرطیکہ عقیدے کی تفریق کو بھی ایک عنصر کے طور پر شامل کر لیا جائے' اسلامی ریاست ان عناصر کے ہوتے ہوئے بھی اسلامی نہیں کہلا سکتی تاوقتیکہ اس میں رہنے والے باشندگان کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل نہ ہو اور اس ریاست کے دستور میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار نہ کیا گیا ہو یا مسلمانوں کی اکثریت تو بے شک نہ ہو لیکن حکومت و اقتدار میں ان کا کردار کلیدی ہو اور وہاں کا دستور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار کرتا ہو۔

رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کی جغرافیائی حدود سے باہر رہتے ہوں' وہ ایک اعتبار سے مسلمان امت اور اسلامی ریاست کا حصہ تو ہیں' لیکن غیراسلامی ریاست میں رہنے کی وجہ سے اسلامی ریاست ان کے تحفظ کے لیے جواب دہ نہیں۔ امت کے عالم گیر تصور کے تحت ایک دوسرے مفہوم میں وہ یقیناً "اسلامی ریاست" کے باشندے ہیں کیونکہ انہوں نے عقیدے کے اعتبار سے اسلام کو بطور نظام اپنا لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ انفرادی زندگی میں تو مسلمان ہیں لیکن غیراسلامی ریاست کا اجتماعی نظام انہیں اسلامی زندگی مہیا کرنے سے منکر ہے۔ اسلامی ریاست کے باشندے صرف اسی مفہوم میں اسلامی ریاست کے باشندے ہیں کہ وہ عقیدے کی وجہ سے اس ریاست

کے شہری ہیں۔

اب اگر کوئی مسلمان اپنا مذہب بدل ڈالے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کی عالمگیر برادری سے بغاوت کا اعلان کیا ہے' اس نے اللہ کی سلطنت سے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے۔ اب ذرا سورہ بقرہ کی "لا اکراہ فی الدین" سے ماقبل کی آیات کو ایک دفعہ پھر دیکھئے جن میں تمام کائنات پر اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا بیان ہے۔ جب کسی شخص نے یہ سب باتیں خوب سوچ سمجھ کر اختیار کی ہیں اور اللہ کی سلطنت میں شعوری طور پر شہریت اختیار کی ہے تو اب دین کے بدل دینے سے وہ کہاں جا سکتا ہے۔ کیا غیراسلامی حکومت میں اللہ کا اقتدار اعلیٰ نہیں ہے حالانکہ پہلے اس نے تسلیم کیا تھا کہ تمام کائنات پر اللہ کی حاکمیت ہے۔

اس لیے مرتد کے بارے میں یہ کہنا کہ ہر شخص کو آزادی رائے کا حق حاصل ہے اور لا اکراہ فی الدین کا مطلب یہ ہے کہ جب جی میں آئے اپنی پسند کا مذہب اختیار کر لیا جائے' بالکل غلط ہے

مرتد کو قتل سے قبل ایک موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے فیصلے سے رجوع کر کے اسلام میں داخل ہو جائے۔ وہ ارتداد پر مصر رہے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس کے مال کو ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ تفصیلی احکام کے لیے کتب فقہ سے رجوع کیجئے۔

۷ - بغاوت

حدود کی فہرست میں بغاوت آخری حد ہے۔ اس جرم پر قتل کی سزا ہے۔ بغاوت کے لیے قرآن میں جو لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی اصل "**بغی**" ہے۔ یہ تین حروف' ب غ ی' کا مجموعہ ہے' لفظ بغاوت اسی سے نکلا ہے۔ البغی سے لغوی مراد کسی شے کی طلب میں میانہ روی ترک کر کے تجاوز کی کوشش کرنا ہے"۔ یہ مفہوم مطلق ہے۔ عدل و انصاف سے بھی آگے جا کر کوئی عدم اعتدال کا رویہ اختیار کرے تو اسے احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے جو اللہ کو مطلوب ہے' وہی شخص مقام اعتدال سے نیچے آئے تو بغاوت ہے۔ "**بغت المراۃ**" عورت کے فعل حرام کاری کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عفت کی حدود سے تجاوز کر کے اعتدال کو چھوڑ دیتی ہے۔

اسلامی ریاست' باشندگان ریاست سے اطاعت کے ضمن میں اعتدال کا تقاضا کرتی ہے۔ اعتدال چھوڑ کر دوسرا رویہ اختیار کیا جائے تو اسے بغاوت کہا جاتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں بغاوت کی ایک تعریف یوں ہے۔

قوم مسلمون خرجوا علی الامام العادل[۱۳]

مسلمانوں کا ایسا گروہ جو امام عادل (اسلامی ریاست) کے مقابلہ میں خروج کرے۔

اس اصطلاحی تعریف میں باغیوں کے لیے مسلمان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعتقادی لحاظ سے یہ لوگ مسلمان ہی ہوتے ہیں مگر تعبیر میں غلطی کے باعث اسلامی حکومت کے خلاف ہتھیار بند ہو کر خود کو واجب القتل ٹھہرا لیتے ہیں۔ قرآن میں باغیوں کے لیے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ (حجرات' ۴۹: ۹)

اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔

بغاوت اس نظام کے خلاف جنگ ہے جس کے تحت کسی اسلامی ریاست میں مسلمان زندگی گزارتے ہیں۔ اس نظام میں افراتفری پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لیے سکون سے زندگی گزارنا محال کر دیا جائے' بے چینی پیدا کر کے لوگوں کو امام کے خلاف ابھارا جائے۔ یہ کوشش بالآخر ضعف ریاست کا سبب بنتی ہے' اس لیے بغاوت جیسے فتنے کو ابتداء ہی سے کچل دینے کے لیے اس حد کے احکام نازل کیے گئے ہیں۔

اسلامی ریاست سے خروج پر' نفاذ حد کے لیے یہ آیت ہی نہیں کئی احادیث اور صحابہ کا عمل بھی ثابت کرتا ہے کہ باغی واجب القتل ہے۔ بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں امام کی اطاعت کے احکام ملتے ہیں۔ بخاری کی ایک حدیث میں امام کی اطاعت کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی اطاعت قرار دیا۔ کئی احادیث میں امام سے خروج کے باعث تمام اعمال ضائع ہونے کے بارے میں بھی کہا گیا ہے۔ ایک حدیث میں تو فرمایا کہ امامت چھیننے کی کوشش کرنے والے کی گردن اڑا دو۔

انہی احکام پر صحابہؓ کے عمل کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں کچھ لوگوں نے زکوۃ دینے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کیا کیونکہ ان لوگوں کا یہ فعل بغاوت ہی کی ایک قسم تھی۔ اس فیصلہ کو تمام صحابہ نے قبول کیا۔

باغیوں سے جنگ اور کفار یا کافر ریاست سے جنگ میں بہت فرق ہے۔ یہ لوگ کچھ بھی ہوں' مسلمان ہی ہوتے ہیں' اس لیے فقہاء کے خیال میں جنگ سے قبل انہیں راہ راست پر آنے کے لیے موقع دیا جائے گا۔ باز آ جائیں تو ان کا قتل جائز نہیں ہے۔ دوران جنگ میں گرفتار ہونے والوں کے بارے میں امام کو گمان قوی ہو کہ اب

ان کی قوت دم توڑ گئی ہے اور آئندہ ان سے خطرہ نہیں ہے تو یہ لوگ رہا کیے جا سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں انہیں قید رکھا جائے گا یا انہیں کوئی دوسری تعزیری سزا دی جائے گی۔

باغیوں کے بارے میں ایک اصولی بات یہ ہے کہ ان کی بیخ کنی سے فتنے کا قلع قمع مقصود ہے۔ انہیں قتل کیے بغیر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو بھی جائز ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکوؤں اور باغیوں میں بھی عظیم الشان فرق ہے۔ ڈاکو عوام کے جان و مال کے در پے آزار ہوتے ہیں' اس لیے وہ کسی رو رعایت کے مستحق نہیں ہوتے لیکن باغی ریاست کے خلاف بزعم خود ایک اصولی جنگ کرتے ہیں' لوگوں کے جان و مال سے نہیں کھیلتے اس لیے توبہ کر لیں تو ان سے جنگ و جدل جائز نہیں ہے۔

قصاص و دیت

قصاص کے جرائم میں دو جرم ہیں' عمداً قتل کرنا اور عمداً زخمی کرنا۔ ان دونوں کے بدلے میں جو سزا بطور قتل یا اس کے علاوہ جسمانی طور پر دی جائے اسے قصاص کہتے ہیں۔ دیت کے جرائم میں' قتل عمد سے مشابہ قتل' قتل خطا اور ان زخموں کی صورت میں مالی تاوان جن کا بعینہ مجرم کو لگانا ممکن نہ ہو' شامل ہیں۔ اسی طرح قصاص کے متضرر (Victim) کی طرف سے دیت (Money Consideration) کا مطالبہ ہو تو یہ بھی دیت ہے۔ قصاص کے بارے میں قرآن کی وضاحت اس طرح ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (بقرہ ۲: ۱۷۸)

تمہارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا۔ غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو' تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہ آیت اس قصاص کے لیے ہے جس میں عمداً انسانی جان کا اتلاف ہو۔ متضرر محض مجروح ہو تو قرآن کا یہ

حکم ہے۔

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ (مائدہ ۵: ۴۵)

جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔

قتل عمد، قتل شبہ عمد، قتل خطا، قتل بالتسبب کے درمیان باریک معنوی فرق و امتیاز ہے۔ ان اصطلاحات کی محض تعریفیں ہی اتنی جزئیات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ان مختصر صفحات میں تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے قصاص و دیت کے بارے میں یہاں اجمالی احکام کے بیان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان احادیث کا بیان بھی ممکن نہیں جن میں ان مسائل پر تفصیلی احکام ملتے ہیں۔

قتل عمد سے مراد کسی ایسے آلۂ قتل کے ذریعے انسان کی جان لینا ہے جس سے عام طور پر انسان مر جاتا ہے جیسے خنجر، آتشیں اسلحہ، زہر اور صراحتاً مہلک اقدام وغیرہ۔ قتل عمد کی سزا قاتل کی موت ہے۔

قتل شبہ عمد سے مراد کسی ایسے آلے سے انسان کی جان لینا ہے جس سے عام طور پر انسان کی موت واقع نہ ہوتی ہو جیسے دو آدمی لڑتے لڑتے لاٹھی وغیرہ سے ایک دوسرے کی پٹائی کریں، پتھر وغیرہ ماریں اور اتفاقاً ایک کی جان چلی جائے۔ اس نوع کے قتل کی سزا سو اونٹ بطور دیت ہے۔ اونٹوں کے علاوہ، سونے اور چاندی کے ذریعے بھی دیت ادا کی جا سکتی ہے یا ان کی قیمت کو معیار بنایا جا سکتا ہے۔

قتل خطاء کی دو صورتیں ہیں، ایک نیت میں خطاء اور دوسری فعل میں خطاء۔ نیت میں خطاء یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص شکار کرتے وقت جانور پر گولی چلائے لیکن کسی انسان کے جا لگے۔ یہاں فاعل کی نیت کچھ تھی لیکن ہوا کچھ اور۔ اسے نیت میں خطاء کہا جاتا ہے۔ فعل میں خطاء یہ ہے کہ راستے میں کنواں وغیرہ کھود کر بغیر حفاظتی جنگلہ لگائے چھوڑ دیا جائے جس میں کوئی گر کر ہلاک ہو جائے تو یہ خطاء فی الفعل ہے۔ کیونکہ فعل کے وقت کسی کو ہلاک کرنے کی نیت نہ تھی۔ دونوں صورتوں میں فاعل پر واجب ہے کہ مقتول کے ورثاء کو دیت ادا کرے (نساء، ۴: ۹۲)

قتل بالتسبب میں نیت کا عمل دخل ہوتا ہے، نہ نیت میں خطاء ہوتی ہے، اور نہ فعل میں خطاء ہوتی ہے جیسے کوئی نیم خوابی کی حالت میں چھت سے نیچے راہ گیر پر جا گرے، خود بچ جائے اور راہ گیر کی موت کا سبب بن جائے۔ قتل کی یہ صورت بھی قتل خطاء سے ملتی جلتی ہے، اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو قتل خطاء کا ہے۔ جزئیات میں کئی

تفصیلی احکام آ جاتے ہیں۔

قتل کے علاوہ انسانی جسم کو زخم لگایا جائے تو اس کا بھی قصاص ہے۔ فقہاء نے ایسے زخموں کو چار انواع میں تقسیم کیا ہے۔

۱- اعضاء کو قطع کر کے جسم سے الگ کر دینا' جیسے کان کاٹ ڈالنا۔

۲- اعضاء کی صلاحیت ضائع کر دینا ہے' جیسے کان کی قوت سماعت زائل کر دینا۔

۳- سر یا چہرے پر زخم لگانا جس کی گیارہ اقسام ہیں۔ انہیں شجاج کہتے ہیں۔ شجاج شجہ کی جمع ہے۔

(۱) - حارصہ۔ جلد پر خراشیں آئیں لیکن خون نہ نکلے۔

(۲) - دامعہ - خون نکلے لیکن جاری نہ ہو۔

(۳) - دامیہ - خون جاری ہو جائے۔

(۴) - باضعہ - جلد سے آگے' گوشت کٹ جائے۔

(۵) - متلاحمہ - گوشت کے اندر گہرا زخم لیکن سمحاق سے کم۔

(۶) - سمحاق۔ گوشت اتنا کٹ جائے کہ گوشت اور ہڈی کے درمیان جھلی' سمحاق' ظاہر ہو جائے۔

(۷) - موضحہ - جس میں سمحاق بھی ظاہر ہو جائے۔

(۸) - ہاشمہ - ہڈی توڑ زخم لیکن ہڈی اپنے مقام پر رہے۔

(۹) - منقلہ - جس میں ہڈی ٹوٹ کر اپنے مقام سے ہٹ جائے۔

(۱۰) - آمہ - سر کی ہڈی اس طرح ٹوٹے کہ زخم دماغ کے گرد لپٹی جھلی تک پہنچ جائے۔

(۱۱) - دامغہ - وہ زخم جس میں دماغ کی جھلی کٹ جائے۔

۴- جسم کے باقی زخم جن کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) - جائفہ - وہ زخم جو سامنے یا پشت کی جانب سے پیٹ یا سینے تک پہنچ جائے۔

(۲) - ان تمام زخموں کے علاوہ باقی زخم غیر جائفہ کہلاتے ہیں یعنی جو پیٹ یا سینے تک نہ پہنچیں۔

مذکورہ بالا تمام جرائم پر کبھی قصاص یعنی زخم کے مساوی زخم' کبھی دیت یعنی مالی تاوان اور کبھی تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔

حدود' قصاص اور تعزیرات پر ایک طائرانہ نظر ہی ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کا نظریہ جرم و سزا

کسی قدر مکمل، متنوع، متحرک اور ہمہ پہلو ہے۔ سزا کا بڑا حصہ مجرم کی ذات کے گرد چکر کاٹتا ہے اور یہ مختصرالمیعاد ہے۔ اس نظام میں مجرم کے متعلقین بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔ اور جہاں ہوتے ہیں وہاں ان کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے برعکس جدید نظام قانون میں قید خانوں کے نظام نے تمام معاشرت کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیئے ہیں۔

تعزیری سزائیں

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ تعزیر ایک صوابدیدی سزا ہے جس کی تنفیذ بلاتحدید نہیں ہے۔ اس صوابدیدی سزا کے اسلوب متنوع ہیں جن کا مختصراً بیان اس طرح ہے۔

۱۔ قتل

تعزیری سزا کے طور پر سے سخت ترین سزا فقہاء کے نزدیک قتل ہے۔ بظاہر قتل وہ انتہائی سزا ہے جو حد کے طور پر نافذ ہوتی ہے اور دوسری تمام سزاؤں کو اس سے کم تر ہونا چاہیے اور یہ کہ تعزیر کے مفہوم میں پوشیدہ معانی لیے جائیں تو بطور تعزیر یہ سزا دینا اس کے اساسی مفہوم کے برعکس ہے، کیونکہ تعزیر کا ایک بڑا مقصد مجرم کی تادیب ہے۔ تادیب اسی وقت ممکن ہے جب مجرم زندہ رہ کر سزا کے بعد اپنی اصلاح کرے۔ اگر کسی جرم میں، جو حد نہ ہو، اسے بطور تعزیر قتل کی سزا دی جائے، تو یہ تعزیر کے بنیادی مفہوم کے منافی ہے۔ لیکن یہ نتیجہ نکالنا دو وجوہ کے باعث درست نہیں ہے۔

اول یہ کہ ہر قانون کے بیان کے بعد اس میں استثناءات (Exceptions) بھی رکھے جاتے ہیں تاکہ قانون میں لچک رہے اور بدلتے حالات میں فطرت کے قریب رہ کر اس کے مطابق فیصلے ہو سکیں۔ اس قاعدے سے دنیا کا کوئی قانون مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے سزائے قتل بطور تعزیر عام اصل کلی سے ہٹ کر بطور استثناء لی ہے جس کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں۔

ایک شرط یہ ہے کہ تعزیراً سزائے قتل اسی وقت دی جائے جب مفاد عامہ کا تقاضہ ہو۔ کسی اور ذریعے سے مفاد عامہ کا حصول ممکن نہ ہو۔ دشمن ملک کے کسی جاسوس نے اسلامی ریاست کے بارے میں ایسی حساس معلومات حاصل کر لی ہوں جس کا افشاء قومی مفاد میں نہ ہو۔ افشاء ہونے سے سنگین نتائج نکل سکتے ہوں۔ ایسے مجرم کو محبوس کیا جائے تو بھی بہرصورت اس کا امکان رہتا ہے کہ وہ یہ حساس معلومات اپنے ملک تک کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچا سکتا ہے۔ ایسے شخص کو چھوڑ دینا تو بالکل ہی خارج از امکان ہے۔ قیدیوں کے ساتھ تبادلہ بھی یہ حساس معلومات خود دشمن کو پیش کرنا ہے، کوئی اور صورت بھی نہیں رہتی۔ ان حالات میں صرف ایک ہی صورت باقی رہتی ہے کہ

ایسے مجرم کو ہلاک کر دیا جائے' یہی قومی مفاد ہے۔ غور کیجئے کہ اس مثال میں سوائے مجرم کے قتل کے کوئی اور راستہ نہیں جسے اختیار کیا جا سکے۔

دوسرے یہ کہ تعزیر کے معانی میں یقیناً تادیب کا مفہوم ہوتا ہے لیکن یہ مفہوم عمومی اعتبار سے لیا جاتا ہے اس سے مراد یقیناً مجرم کی تادیب ہے مگر جرم کی طرف میلان رکھنے والے دوسرے متردد' جرم کی منصوبہ بندی کرنے والے' جرم کر کے قانون کی گرفت میں نہ آنے والے افراد کی تادیب کہنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہاں تعزیر سے مراد محض مجرم ہی کی تادیب نہیں' جرم کی طرف میلان رکھنے والے دوسرے لوگوں کی تادیب بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس مقام پر فقہاء نے جب تعزیراً سزائے قتل کا جواز نکالا تو اس تعزیر سے سارے معاشرے کی تعزیر تھی نہ کہ کسی خاص فرد کی تعزیر۔

تعزیراً سزائے قتل جاری کرنا انتہائی کم اور مخصوص حالات ہی میں ہو سکتا ہے۔

۲۔ کوڑے

مجرم کو زندہ رکھ کر تعزیراً دی جانے والی سزاؤں میں سرفہرست کوڑوں کی سزا ہے۔ یہ وہ سزا ہے جسے اسلامی فوجداری قانون میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ سزا جاری کرنے کی غرض وغایت' حکمت اور فلسفہ سمجھ لیا جائے تو بڑے بڑے قید خانے بنانے کی ضرورت نہ رہے جو حکومت کے لیے بہت بڑا مالی بوجھ بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ رائج الوقت کوڑوں کی سزا سے مراد شریعت اسلامیہ والے کوڑے نہیں بلکہ کوڑوں کی موجودہ سزا انگریزی تاریخ کا تسلسل ہے جس کا اسلامی شریعت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس سزا کو انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں اقتدار کے لیے خطرہ بننے والے مقامی افراد کے لیے وضع کیا تھا۔ اس لیے اگر کسی کو اس سزا میں کوئی "وحشیانہ پن" نظر آئے تو اسے انگریزوں کی باقیات پر معمول کرے نہ کہ اس کا تعلق اسلامی شریعت سے جوڑا جائے۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس وحشیانہ سزا کا نشانہ بننے والے تحریک جہاد کے علماء اور آزادی کی جنگ لڑنے والے دوسرے حریت پسند ہی رہے۔ بعد میں اس سزا کا دائرہ پھیلا کر دوسرے اخلاقی مجرموں تک بڑھا دیا گیا۔

اب ملک میں کم و بیش تمام قانون سازی انگریزی دور کی رہین منت ہے۔ انگریزی دور کے وضع کردہ اس کوڑے کو اسی ہیئت' اسی سائز اور اسی اسلوب سے مارنے کا رواج انگریزی قانون کا نتیجہ ہے جس کا پیوند اسلامی حدود کے ساتھ جوڑ دیا گیا' ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں کوڑوں کی سزا کی غرض و غایت مجرم کو از حد

تشدد دینا نہیں' ہلکی مار کے ساتھ جرم کا احساس دلانا ہے۔ کوڑے سے مجرم کی کھال ادھیڑ دینے کا تصور اسلامی تصور جرم و سزا میں دور دور تک نہیں ہے۔ اس کے موجد آج کل کے انسانی حقوق کا داعیان ہی ہیں۔

ممکن ہے اس وضاحت کے باوجود کوڑوں کی سزا کو بعض کج فہم افراد "انسانی وقار اور انسانی حقوق کے منافی" سمجھیں لیکن سمجھنے کی غرض سے کیے گئے مطالعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اسلام جرم کا تعلق صرف مجرم کی ذات سے جوڑتا ہے' اس کے جرم کا خمیازہ کسی دوسرے انسان کو بھگتنے پر مجبور نہیں کرتا۔ کوئی شخص جرم کرے اقرار' گواہی' واقعاتی شواہد وغیرہ سے جرم ثابت ہو جائے تو اسلامی عدالت جرم کی نسبت سے اسے چند کوڑوں کی سزا دے گی جس سے مجرم کی تادیب ہو جائے گی' اور اگلے دن وہ اپنے معمول کے کام پر چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ بیوی شوہر سے محروم نہ ہو گی' بچے باپ کی صورت کو نہ ترسیں گے' والدین کے بڑھاپے کا سہارا ان کے سامنے رہے گا' اور یوں معاشرہ' مجرم کی وجہ سے جو ذرا سا اپنے محور سے ہٹا تھا' اگلے ہی دن معمول کے مطابق ہو گا۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ مسلم معاشرے یا مسلم حکومتوں میں حدوداللہ کو چھوڑ کر کوڑوں کی سزا کا اجراء اور نفاذ بہت کم ہوا ہے۔ یہ عدالت کی صوابدید پر ہے کہ مجرم کی تادیب کے لیے کیا سزا تجویز کی جائے۔ اسلامی شریعت کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کو دیکھا جائے تو پہلی نظر ہی میں واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی سزائے قید بالخصوص غیرانسانی' انسانی حقوق سے متصادم' انسانی شرف اور وقار کے منافی اور سراسر غیر منطقی ہے۔ جن جن مقامات پر اسلامی شریعت مجرم ہی کو سزا دینے پر اصرار کرتی ہے وہاں یہ قوانین مجرم کو قید کر کے اس کے بیوی بچوں' والدین' بہن بھائیوں اور دیگر تمام رشتہ داروں کو سزا دیتے ہیں۔ بلاشبہ بعض مقامات پر' ناگزیر حالات میں اسلامی شریعت بھی سزائے قید کو کراہتاً" قبول کر لیتی ہے لیکن یہ آخری چارہ کار کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ اسے ابتداً ہی اختیار کر لیا جاتا ہے۔ کہاں تو حضرت عمرؓ کا یہ انتظامی فرمان کہ چار ماہ سے زائد عرصے کے لیے مجاہدین اپنی بیوی سے دور نہ رہیں' کہاں ایلاء کے معاملہ میں یہ سخت فرمان کہ رجوع کرنا ہے تو چار ماہ کے اندر اندر بیوی سے مقاربت کر کے کفارہ ادا کر لو' دوسری صورت میں میاں بیوی کے درمیان طلاق ہو جائے گی۔ اور کہاں سرکاری خزانے سے چند ہزار روپے غبن کرنے کے جرم میں سالوں کی قید؟ اسلامی ریاست امن و امان بہتر بنانے کے لیے اسلحہ کی نمائش پر پابندی لگا سکتی ہے۔ ناجائز اسلحہ برآمد ہونے پر کوئی دوسری مناسب سزا دے سکتی ہے لیکن ان معمولی جرائم پر پانچ پانچ دس دس سال کی قید انسانی وقار اور شرف کے منافی ہی نہیں' انسان کے دوسرے متعلقین کے ساتھ ظلم بھی ہے۔ اس غیرانسانی سزا کا نشانہ بچے' بیوی' والدین' بہن بھائی اور دوسرے تمام قرابت دار بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اسلامی شریعت نے کوڑوں کی سزا وضع کی جس کا نشانہ سوائے مجرم کے کوئی نہیں بنتا۔

کسی سائنسی تحقیق کے ذریعے دونوں سزاؤں کا آپس میں اس طرح موازنہ کیا جائے کہ ان کے نتائج سامنے آ جائیں تو غالب گمان یہی ہے کہ تمام سائنسی تحقیق کے نتائج کوڑوں کی سزا کے حق میں نکلیں گے۔ اس سزا کا نشانہ بننے والا خود مجرم ہوتا ہے۔ دوسری طرف سزائے قید کی صورت میں ایک فرد کے ساتھ اس کا خاندان اور پورا قبیلہ بھی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ باپ کی شفقت سے محروم ہونے والے بچے کی شخصیت کن تغیرات کا شکار ہوئی' بیوی کن معاشرتی عوامل کی لپیٹ میں آئی' بوڑھے والدین کی بے چارگی کا مداوا کیسے ہو' مربوط دانوں کو تسبیح کی شکل دینے والی ڈور نکل جانے سے تسبیح کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کو متصور کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ ادھر کوڑوں کے خلاف سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی کہ یہ انسانی شرف اور وقار کے منافی ہیں۔ حالانکہ خود مجرم سے یہ سوال کیا جائے کہ تمہیں چند کوڑوں (اسلامی معیار کے مطابق) کی سزا دی جائے یا دس سال قید بامشقت' تو ننانوے فیصد امکان ہے کہ اپنے نام نہاد انسانی شرف و وقار کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اپنے لیے کوڑوں کی سزا پسند کرے گا۔

۳- قید

ایک جملے میں یہ کہہ دینا کہ سزائے قید اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے یا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے' آسان نہیں ہے۔ حالات و زمانے میں اس قدر تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ کہ نئے ابھرنے والے تصورات کا مطالعہ قرآن و سنت کی روشنی میں ناگزیر ہو چکا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سزائے قید خود رسول اللہ ﷺ نے دی' اس کی مثالیں صحابہ کے دور میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں باقاعدہ قید خانے تعمیر کرائے۔ یقیناً یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سزائے قید رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کن حالات میں دی۔ لیکن یہ بالکل واضح ہے کہ جس کثرت کے ساتھ موجودہ دور میں انسانوں کو معمولی معمولی جرائم پر پابند سلاسل کیا جاتا ہے یا عدالتی عمل مکمل ہونے سے قبل ہی انتظامیہ کو بے محابہ اختیار دیئے جاتے ہیں اور محض شبہ میں لمبے عرصے کے لیے لوگوں کو قیدخانوں میں بند کر دیا جاتا ہے' ان کے مقدمات عدالتوں میں پیش ہی نہیں کیے جاتے یا لوگوں کی معمولی معمولی فروگزاشتوں پر انہیں سزائے قید دی جاتی ہے۔ جب کہ مجرم کی تادیب کے لیے ریاست کے پاس دوسرے وسائل بھی ہوں' یہ سب غیر اسلامی ہے۔ اسلامی شریعت کا ایسے فوجداری نظام سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جہاں تک اس سزا کے شرعی جواز کا تعلق ہے' تو یہ سزا قرآن سے ثابت ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا (نساء ۴: ۱۵)

تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔

یہاں بے حیائی کا ارتکاب کرنے والی عورتوں کا ذکر ہو رہا ہے اس آیت میں ایسی عورتوں کو گھروں میں قید کرنے کا حکم تھا۔ یہ حکم ابتدائی تھا' بعد میں سورہ نور میں اس فعل کی سزا مقرر کر کے اللہ نے ان کے لیے راستہ نکال دیا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں سزائے قید باقاعدہ شکل میں نہ تھی اور نہ قید خانے بنائے گئے تھے تاہم اس سزا کا تصور موجود تھا اور قیدیوں کو گھروں یا مسجد میں محبوس کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں بھی اس پر کوئی قابل ذکر اضافہ نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں ایک مستقل قید خانہ قائم ہوا۔ آپ نے حضرت صفوانؓ بن امیہ سے چار ہزار درہم میں ایک مکان خریدا اور اسے قید خانے میں تبدیل کر دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں ایک خطرناک چور کو محبوس کیا جو قید ہی کی حالت میں فوت ہوا۔ حضرت علیؓ کے دور میں کوفہ میں بھی ایک قید خانہ تھا جہاں مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔

ان شواہد کی بناء پر سزائے قید کو بعض فقہاء نے اسلامی شریعت کے مطابق قرار دیا ہے۔ لیکن آج کل کی سزائے قید اور اسلامی تصور قید میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اسلامی شریعت عدالتی عمل کے بعد ہی کسی کو قید کرنے کی اجازت دیتی ہے' اس سے قبل بلا جواز چالان روک کر لمبی مدت تک کے لیے لوگوں کو محبوس کرنا بالکل غلط ہے۔ اسلامی شریعت انتہائی ناگزیر حالات میں سزائے قید دیتی ہے۔ اس سے قبل شریعت اسلامیہ کے پاس مجرم کی اصلاح کے کئی دوسرے طریقے بھی موجود ہیں۔ قید سے قبل اس کا ایک بدل جلاوطنی بھی ہے۔ مخصوص حالات میں مجرم کو کسی دوسرے علاقے میں چلے جانے کا حکم بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مجرم کے لیے تو یہ سزا شمار ہوتی ہے لیکن جلاوطنی میں اس کے اہل و عیال چاہیں تو اس کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ بیوی بچے مجرم کے ساتھ رہنا چاہیں تو اس طرح خاندان کا تانا بانا منتشر ہونے سے بچ جاتا ہے۔ قید کی صورت میں ایک مکمل خاندانی اکائی بکھر جاتی ہے' بالخصوص جب خاتون قیدی کا معاملہ ہو تو کئی ذیلی پیچیدہ مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ حاملہ عورت کو کیسے قید کیا جائے' وضع حمل کے بعد بچے کو قیدخانے کی چار دیواری میں آخر کس جرم میں قید رکھا جائے اور بچہ قید خانے سے باہر بھیجا جائے تو اس کی پرورش کیونکر ہو' اور بچے کو ماں سے کیوں جدا کیا جائے' یہ وہ تمام مسائل ہیں جن کا مکمل جواب تہذیب حاضر ہی کے ذمہ ہے کہ جس نے قیدخانوں کے نظام کو بلاجواز وسعت دے کر خاندانی نظام کے تار و پود

بھیر کر رکھ دیئے ہیں۔ رہا اسلام! تو اس کے پاس مجرم کی تادیب کے متنوع وسائل ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

اسلامی شریعت میں سزائے قید کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

۱۔ مجرم پر سزا جاری ہونے کے بعد مخصوص مدت کے لیے قید کر دیا جائے۔

۲۔ مجرم کو اس وقت تک قید کر رکھا جائے جب تک وہ توبہ نہ کر لے یا اس کے مجرمانہ خصائص ختم نہ ہو جائیں، جیسے کسی شخص کی بداعمالیوں کی وجہ سے محلّہ کی شریف زادیاں شرافت سے نہ رہ سکیں تو اصلاحی تدابیر کے ناکام ہونے پر مجرم کو توبہ کرنے تک قید کر دیا جائے گا یا وہ اس قدر ضعیف ہو جائے کہ ان بداعمالیوں پر قدرت نہ رکھے تو بھی رہا کر دیا جائے گا۔

۳۔ سزائے قید کے ساتھ جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

۴۔ جرم کی نوعیت اور مجرم کی صلاحیتوں کے مطابق دوران قید میں قیدی سے مشقت بھی لی جا سکتی ہے۔ مشقت سے مراد ایک نئی جسمانی سزا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجرم کو اپنے جرم کا احساس رہے اور اس کی انسانی صلاحیتوں کو کام میں لایا جاتا رہے۔

۴۔ علاقہ بدری

علاقہ بدری کی سزا قرآن کی سورۃ مائدہ آیت ۳۳ سے ثابت ہے۔ اس آیت میں محاربہ کی صورت میں چند سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ سزا بھی انہی میں سے ایک ہے۔ غالباً اس سزا کے اسی جواز کو بنیاد بناتے ہوئے صحابہؓ کے عمل سے بھی ہمیں اس کا پتا چلتا ہے۔ اس سزا کے نفاذ سے قبل وہی دو اصول پیش نظر رکھنا لازمی ہے کہ سزا کی مدت جرم سے مطابقت رکھے اور یہ کہ معاشرے کو مجرم کے وجود سے پاک رکھنا ضروری ہو۔ حضرت عمرؓ نے معاشرے کو فساد سے پاک رکھنے کے لیے ایک شخص کو بلا کسی جرم کے جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ صاحب اتنے حسین و جمیل تھے کہ ان کے حسن کا تذکرہ مدینہ کی عورتوں میں ہونے لگا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مصلحتاً ان کو ایک دوسرے علاقے میں بھیج دیا جہاں اس فتنہ کا اندیشہ نہ تھا[۱۳]۔

علاقہ بدر کرنے کی ایک غایت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجرم کو ان حالات اور ماحول سے دور کر دیا جائے جن کے اندر رہتے ہوئے اس کو جرم کے جملہ عناصر دستیاب ہو گئے ہوں۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص معن بن زائدہ کو بیت المال کی جعلی مہر بنانے کے جرم میں مختلف سزائیں دینے کے بعد بالآخر ملک بدر کر دیا[۱۴]۔ یہاں پر علاقہ بدر یا ملک بدر کی اصطلاحوں سے یہ غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ مجرم کو اسلامی ریاست سے باہر بھیج دیا جاتا تھا (اگرچہ امام

مالکؒ کی یہی رائے ہے کہ مجرم کو اسلامی ریاست کی حدود سے باہر بھیج دیا جائے)۔ اس سے مراد اسلامی ریاست ہی کے اندر کسی دور دراز علاقے میں بھیجنے کو جلاوطنی کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب معن بن زائدہ کو یہ سزا دی تو غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ مجرم کو بیت المال سے دور رکھا جائے۔ دوسرے اسے ان وسائل سے بھی دور کر دیا جائے جو جعلی مہریں بنانے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے جیسے جعلی چھاپہ خانے بنانے والے کسی مجرم کو ملک کے بڑے اور صنعتی شہروں سے نکال کر کسی دور افتادہ دیہی قبائلی معاشرے میں رہنے پر مجبور کر دیا جائے جہاں جعلی چھاپہ خانہ تیار کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہ ہو۔

۵۔ جرمانہ

جرم کی تلافی کے لیے اور مجرم کی اصلاح و تادیب اور معاشرے کو فساد سے بچانے کی غرض سے مجرم کو مالی سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ یہ سزا کی تعزیری شکل ہے اس لیے ملک کی مقننہ کو اس بارے میں قانون وضع کرنے کا اختیار ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس شے پر جرم کیا گیا ہو اسے ضبط کر کے استعمال میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ ایسی اشیاء شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہوں تو انہیں تلف کرنا پڑتا ہے، کوئی مسلمان موسیقی کے آلات کی خرید و فروخت کرتا ہو، مجسمہ سازی کرتا ہو، شراب کا کاروبار کرتا ہو تو یہ تمام اشیاء ضبط کرنے کے بعد تلف کر دی جائیں گی۔ جن برتنوں میں شراب ہو ان کو توڑ کر ضائع کرنا ضروری ہے، لکڑی یا پلاسٹک کے مٹکے برتن وغیرہ ہوں تو جلا دیئے جائیں۔ کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کی جائے تو ان اشیاء کا تلف کرنا ضروری نہیں، مثلاً دودھ میں پانی ملانے پر دودھ ضبط کر کے غرباء میں تقسیم کر دیا جائے لیکن مضر صحت اشیاء کی ملاوٹ ہو تو تمام اشیاء ضائع کر دی جائیں۔ ضبط شدہ مال کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ مال عام استعمال کا نہ ہو۔ اس کے استعمال کے لیے سرکاری اجازت نامہ درکار ہوتا ہو، جیسے اسلحہ کے لیے لائسنس وغیرہ، یا جعلی سکے، نوٹ، مہریں اور ممنوعہ بور کا اسلحہ ہو۔ دونوں صورتوں میں متعلقہ مال بحق سرکار ضبط کر لیا جائے گا اور شے کی نوعیت کے مطابق اسے ادھر ادھر کر لیا جائے گا۔

جرمانے کے مقاصد بھی وہی ہیں جو پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔ یعنی مجرم کو جرم کا احساس دلانا، اس کی تادیب اور بالآخر اصلاح۔ جدید زمانے کی ہر حال میں سزائے قید کی طرح، ہر حال میں جرمانے کا تصور بھی اسلامی شریعت میں موجود نہیں ہے، نہ اس کا مقصد بیت المال کے لیے مال و دولت کا حصول ہے۔ مجرم کی بدلتی ہوئی حالت کے مطابق یہ سزا کم و بیش بھی ہو سکتی ہے۔ جرمانہ سرے سے موقوف کر دینا بھی ریاست کے اختیار میں ہے اللہ کا

فرمان ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (بقرہ ۲: ۲۸۰)

پس اگر وہ تنگ دست ہو تو اس کی آسودگی تک انتظار کرنا ہو گا۔

مجرم کو جرمانے کی سزا دے کر اسے ادا کرنے کی مہلت بھی دی جائے گی۔ مدت مہلت کا تعین کرنا مقررہ نہیں بلکہ ریاست کے ذمہ ہے۔

غیر روایتی تعزیری سزائیں

اس بات کی یاددہانی ایک دفعہ پھر کر دی جائے کہ اسلامی ریاست میں سزا کا مقصد محض سزا نہیں بلکہ مجرم کو جرم کا احساس دلا کر اس کی اصلاح کرنا ہے۔ اسلامی ریاست میں کسی بھی جرم پر دی جانے والی سزا ایک طرف تو اس کے جرم کے عین مطابق ہوتی ہے اور یوں عدل کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب مجرم کو یہ احساس دلایا جانا بھی پیش نظر ہوتا ہے کہ اس نے اسلامی معاشرے کی مضبوط اقدار و روایات سے ہٹ کر کوئی ایسا کام کیا ہے جس کے باعث اس کا مقام و مرتبہ اہل اختیار اور عوام کے ذہنوں میں وہ نہیں ہے جو جرم کے وقوع سے قبل تھا۔

اس مقصد کے حصول کے لیے قاضی یا ریاست کئی وسائل اختیار کر سکتے ہیں جو ہر شخص کے مقام و مرتبے کے مطابق ہوتے ہیں۔ معاشرتی اقدار پر نظر ڈالیے' ایک عام شخص کو تھانے میں بغرض تفتیش بلایا جائے کہ اس نے کسی جرم میں تھوڑی سی معاونت کی تھی تو اس کے لیے شاید یہ عام سی بات ہو۔ اسی معمولی جرم میں شہر کے معزز' تعلیم یافتہ' صاحب مرتبہ' کسی ریٹائرڈ اعلیٰ افسر وغیرہ کا تھانے میں بلاوا ہی کیے گئے جرم کا مداوا ہو سکتا ہے اور یوں اس کے جرم کی تلافی ہو جائے۔ جرم ذرا سخت ہو تو ہتھکڑی لگانے سے اس کے پندار پر ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ بہت معمولی نوعیت کے جرائم میں کسی شخص کو محض تھانے کی حدود میں پابند کر دینے سے اس شریف آدمی کو احساس دلایا جا سکتا ہے۔ ذرا شدید نوعیت کے جرائم میں کسی ضامن کی ضمانت ہی پر اسے گھر میں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جوں جوں جرم کی کیفیت میں تبدیلی واقع ہو' بغیر شدید تادیبی اقدام کے بھی اسے جرم کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ جرائم جن میں مدعی فرد کے بجائے ریاست ہو' مثلاً ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی' سرکاری عوامی املاک میں بے جا تصرف' سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا' کار سرکار میں مداخلت وغیرہ اس طرح کے مقدمات میں مدعی ریاست ہوتی ہے اور وہ مجرم سے نرمی کا معاملہ کر سکتی ہے' سزا کو موقوف کر سکتی

ہے۔ مکان تعمیر کرتے وقت کوئی شخص سڑک گلی وغیرہ میں اپنی حدود سے تجاوز کرے تو کوئی ضروری نہیں کہ سرکار ایسے شخص پر لاکھوں کا جرمانہ کرے یا اسے قید کر کے گھریلو نظام کو اتھل پتھل کر دے۔ یہاں محض سرکاری زمین سے تجاوزات دور کرنے ہی سے معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص ڈرائیونگ کرتے وقت مسلسل غفلت کا ارتکاب کرے تو کوئی ضروری نہیں کہ اسے قید یا بھاری جرمانے کی سزا دی جائے بلکہ آئندہ کے لیے اسے ڈرائیونگ ہی سے روک دیا جائے اور اس کا لائسنس منسوخ کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا تمام وسائل تعزیری ہیں اور موقع و محل اور جرم کی مناسبت سے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ بعض اخلاقی ذرائع بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اسلامی معاشرہ میں بہت موثر ہیں' معاشرہ کسی مجرم سے معاشرتی طور پر قطع تعلق کر لے تو یہ تمام سزاؤں سے بڑھ کر تادیبی کارروائی ہے جس کے مقابلے میں مجرم کی اصلاح کے لیے دوسرے وسائل یقیناً کم تر ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ کسی مرتشی سرکاری ملازم سے اس کے اہل خاندان' محلّہ دار' اہل قبیلہ اور دوسرے قرابت دار رشوت لینے کی وجہ سے قطع تعلق کر لیں' اس سے بول چال بند کر لیں' اس کے ہاں ناگزیر حالات کے سوا' آنا جانا بند کر دیں' اسے یہ احساس دلا دیں کہ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے اس سے رشتے ناتے نہ کرنے تک جا سکتا ہے' تو یقین کیجئے سال تو دور کی بات ہے' چند ماہ ہی میں وہ اپنے محدود وسائل کے اندر رہنا سیکھ جائے گا۔ لیکن بدقسمتی سے آج کل معاشی میدان میں وہ افراتفری دیکھنے کو مل رہی ہے کہ معاشرے میں غالب اکثریت انہی افراد کی ہے جو خود اس دلدل میں پھنس چکے ہیں اور شرفاء کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ مقاطع کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

اخلاقی وسائل میں سے سرفہرست وسیلہ مجرم سے قطع تعلق کا ہے۔ اس کا ثبوت قرآن و سنت دونوں سے ملتا ہے۔ وہ بیویاں جن کے بارے میں شوہروں کو اندیشہ لاحق ہو جائے کہ وہ نافرمانی کر رہی ہیں یا کریں گی ان کے بارے میں فرمایا کہ انہیں اپنی خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو۔ قرآن میں آتا ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (نساء' ۴: ۳۴)

اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ اور خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو۔

یہ آیت قطع تعلق کے لیے دلیل ہے۔ اس آیت کی تشریح کا موقع یہاں نہیں ہے' تفصیل کے لیے کتب تفاسیر دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہی سزا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہے اور اس قطع تعلق کو متعلقہ افراد کی

توبہ تک اللہ نے سند جواز دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی اصلاح کر کے اس کا نمایاں اظہار کرنے پر مجرموں کو معاف کر دیا جانا چاہیے۔ غزوہ تبوک میں تین اصحابی لشکر سے الگ پیچھے رہ گئے جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے قطع تعلق کا حکم دیا' ان کا پیچھے رہ جانا خدانخواستہ کسی بدنیتی پر مبنی نہ تھا۔ ان میں سے ایک کے اپنے بیان کے مطابق موسم کی خنکی اور آرام طلبی کے باعث انہوں نے محض تساہل سے کام لیا تھا۔

اب رسول اللہ ﷺ کے حکم کی دیر تھی' مدینہ کی زمین ان لوگوں پر تنگ ہو گئی۔ انہوں نے پچاس دن اس حالت میں گزارے کہ نہ کوئی ان سے علیک سلیک کرتا' نہ سلام کا جواب دیتا' باقی تعلقات کی تو بات ہی الگ ہے حتیٰ کہ ایک موقع ایسا آیا کہ یہ اصحاب اپنے گھروں میں بند ہو کر رہ گئے اور رونے لگے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ یہ لوگ اپنی بیویوں سے بھی دور رہیں۔ اس عرصے میں تینوں نے گڑگڑا کر اللہ سے معافی مانگی۔ آخر کار اللہ نے ان کی توبہ قبول کی اور انہیں معاف کر دیا گیا[۱۵]۔

قطع تعلق کی سزا جس اسلوب میں ان تین اصحاب رسول کو خود رسول نے دی' اسے اسی شکل میں نافذ کرنا قدرے دشوار ہے کیونکہ سزا دینے والے خود رسول اللہ ﷺ تھے جن کا مرتبہ و مقام آج کل کے کسی بھی حاکم سے بدرجہا الگ نوعیت کا تھا۔ اس سزا کو قرآنی آیت سے عمومی معنوں میں اخذ کر کے کسی دوسری شکل میں نافذ کیا جائے جو مقامی رنگ میں ہو' اور اسے عوامی تائید بھی حاصل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

غیرروایتی تعزیری سزاؤں کے کئی اسلوب کتب فقہ میں ملتے ہیں لیکن ان کا بیان فقہاء کے اپنے حالات و زمانہ کی رعایت سے تھا۔ ان سزاؤں کے بارے میں اصولی راہ نمائی قرآن و سنت ہی سے ماخوذ ہے۔ ماوردی نے لکھا ہے کہ قاضی کا مجرم سے ترش روئی سے پیش آنا بھی تعزیری سزا ہے۔ اب موجودہ حالات میں ترش روئی کو کسی ایک اسلوب میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ ملک کے ایک حصے میں لوگ باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو بہت کچھ کہہ دیتے ہیں اور اسے ترش روئی پر محمول نہیں کیا جاتا۔ ایک دوسرے رہن سہن کے لوگ الفاظ کے انتخاب میں بھی ذکی الحس واقع ہوتے ہیں' وہ آداب مجلس میں سے ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ترش روئی کے پیمانے جدا جدا ہیں۔ اس لیے تعزیری سزا کا یہ اسلوب مقامی حالات و زمانہ کے اعتبار سے ہے۔

مجرم سرکاری ملازمت میں ہو تو من جملہ دیگر فوجداری سزاؤں کے' جو جرم کے حجم کے مطابق اسے دی جائیں گی' ملازمت سے معزولی کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ جرم کی نوعیت تخفیف ظاہر کرے تو معزولی کی بجائے ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبادلہ بھی جائز ہے۔ جرم بہت معمولی نوعیت کا ہو تو معمولی سرزنش کے ذریعے بھی

سزا دینا آسان ہے۔ سالانہ ترقی روکنا' اگلے درجے میں ترقی دینے سے گریز' قبل از وقت ریٹائرمنٹ لیکن تمام مراعات کے ساتھ' یہ تمام وسائل تعزیری سزا کے اسلوب ہیں جنہیں امام یا قاضی اپنے صوابدیدی اختیارات کے تحت استعمال کر سکتا ہے۔ تعزیری سزاؤں کے بارے میں چند اصولی باتیں ابتدا ہی میں بیان کی جا چکی ہیں۔ ان سزاؤں کے اجراء میں کبھی کبھی قانون سازی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے مقامات پر مقننہ کی حتمی منظوری سے قبل کسی کو تعزیری سزائیں دینا الٰہی فرامین کے منافی ہے۔ جیسے جعلی کرنسی بنانے چھاپنے پر حاکم وقت ہی سزا دینے کا مجاز ہے۔ ملک کے عدالتی حکام کو اس ضمن میں تعزیری سزا دینے کا اختیار دیا جائے تو مختلف علاقوں میں بہت بڑے فرق کے ساتھ افراط و تفریط پر مبنی فیصلے سامنے آئیں گے۔ اس لیے اس بارے میں مقننہ ہی فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ کئی تعزیری سزاؤں کے لیے قانون سازی کی سرے سے ضرورت ہی نہیں' یہ خود قاضی کے صوابدیدی اختیارات میں آ جاتی ہیں۔ ہر دو صورتوں میں عدل اور جرم و سزا میں توازن ضروری ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے

اس باب میں موضوع کے اہم پہلوؤں کا تذکرہ ہی ممکن ہو سکا ہے' تفصیل کے خواہش مند اصحاب مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ اسلام کا فوجداری قانون' جلد اول' دوم' سوم مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی' مطبوعہ لاہور

۲۔ اسلام میں جرم و سزا' جلد اول دوم' مترجم سید معروف شاہ شیرازی' مطبوعہ لاہور

۳۔ قصاص و دیت' ڈاکٹر محمد میاں صدیقی' مطبوعہ اسلام آباد

۴۔ اسلامی قوانین حدود و قصاص' دیت و تعزیرات' ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن' مطبوعہ لاہور

حواشی و حوالہ جات

۱۔ فھو کل وط وقع علی غیر نکاح صحیح ولاشبہ نکاح ولا ملک یمین دیکھئے' **بدایۃ المجتہد**' ابن رشد (۵۹۵ھ) لاہور' ۱۹۸۴ء مکتبہ علمیہ' ج ۲' ص ۳۲۴

۲۔ المفردات ۔ امام راغب اصفہانی دیکھئے ق' ذ' ف

۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے **بدایۃ المجتہد**' کتاب القذف' ابن رشد' ج ۲' ص ۲۳۲

۴۔ السنن' ابوداؤد' کتاب الحدود باب فی الحد فی الخمر۔

۵۔ **بدایۃ المجتہد**' ابن رشد' کتاب القذف' باب فی شرب الخمر۔

۶۔ **بدایۃ المجتہد**، کتاب السرقہ، حوالہ ایضاً۔

۷۔ **بدایۃ المجتہد**، کتاب الحرابہ ج ۲، ص ۳۴۰ حوالہ ایضاً۔

۸۔ **بدایۃ المجتہد**، ج ۲، ص ۳۴۱ حوالہ ایضاً۔

۹۔ بخاری، کتاب الجہاد۔

۱۰۔ ابو داؤد، کتاب الحدود۔

۱۱۔ اصفہانی: المفردات، دیکھئے ب غ ی

۱۲۔ ابن نجیم: البحرا الرائق، کوئٹہ مکتبہ ماجدیہ، ج ۵، ص ۱۴۰۔

۱۳۔ تفصیل کے لیے دیکھئے سرخسی کی المبسوط، کتاب الحدود۔

۱۴۔ "المغنی" ابن قدامہ، بیروت، دارالکتاب العربی، ۱۴۰۳/۱۹۸۳ء، ج ۱۰، ص ۳۴۸۔

۱۵۔ تفصیل کے لیے تفسیر ابن کثیر میں سورۃ توبہ کی آیت ۱۱۹ دیکھئے۔

مصادر و مراجع

۱۔ ابن رشد: محمد بن احمد بن محمد بن احمد (۵۹۵ھ) "**بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد**" لاہور

۲۔ ابن قدامہ: ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد (۶۲۰ھ) "**المغنی**" دارالمنار، ۱۳۶۷ھ

۳۔ ابن کثیر: عمادالدین (۷۷۴ھ) "تفسیر ابن کثیر" (اردو، مترجم عبدالمالک) لاہور مکتبہ تعمیر انسانیت، ۱۹۸۴ء

۴۔ ابن نجیم: زین الدین (۹۷۰ھ) "**البحر الرائق شرح کنز الدقائق**" کوئٹہ، المکتبہ الماجدیہ

۵۔ ابوداؤد: سلیمان بن الاشعث (۲۷۵ھ) "**السنن**" استنبول، دارالدعوہ، ۱۴۰۱ھ

۶۔ اصفہانی: حسین بن محمد، راغب (۵۰۲ھ) "**المفردات فی غریب القرآن**" کراچی، نور محمد کارخانہ کتب

۷۔ بخاری: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم (۲۵۶ھ) "**الجامع الصحیح**" استنبول، دارالطباعہ العامرہ

''مطالعہ اسلامی قانون'' کے مطبوعہ مضامین

۱۔ اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ اول۔قرآن

۲۔ اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ دوم۔سنت

۳۔ اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ سوم۔اجماع

۴۔ اسلامی قانون کے ماخذ، ماخذ چہارم۔قیاس

۵۔ اجتہاد کی تعریف

۶۔ اسلام میں قانون سازی کا تصور اور طریق کار

۷۔ دینی مسائل میں اختلاف، اسباب اور ان کا حل

۸۔ اسلام کا قانون نکاح وطلاق

۹۔ اسلام کا قانون وراثت ووصیت

۱۰۔ اسلام میں عورت کی استثنائی حیثیت اور اس کی وجوہ

۱۱۔ اسلام کا تصور ملکیت ومال

۱۲۔ اسلام کا تصور معاہدہ

۱۳۔ اسلام میں شراکتی کاروبار کا تصور

۱۴۔ مزارعت اور مساقات

۱۵۔ اسلام کا نظام محاصل

۱۶۔ اسلام کا نظام مصارف

۱۷۔ اسلام میں عدل وقضاء کا تصور

۱۸۔ اسلام کا نظام احتساب

۱۹۔ اسلامی نظام عدل وقضاء میں شہادت کا تصور

۲۰۔ اسلام کا تصور جرم وسزا

۲۱۔ اسلام کا فوجداری قانون

۲۲۔ اسلام کا دستوری قانون

۲۳۔ اسلام کا قانون بین الممالک

۲۴۔ اسلام میں ربا کی حرمت اور بلاسود سرمایہ کاری